Regd. L. No.7243

Phone : [illegible]

قرآنی نظامِ ربوبیّت کا پیامبر

طلوعِ اسلام

اگست 1980

اس پرچہ میں :

۱- پیام عید — [قرآن کی عظمت]

۲- سرمایہ داروں کا انجام

شائع کردہ ادارہ طلوعِ اسلام ۲۵-بی گلبرگ-لاہور

قیمت فی پرچہ 3 روپے

قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

طلوعِ اسلام

ماہ نامہ لاہور

بدلِ اشتراک
سالانہ
پاکستان -/۳۶ روپے
غیر ممالک ۳ پونڈ

ٹیلی فون ———— ۸۸۰۸۰۰

خط و کتابت
ناظم ادارہ طلوعِ اسلام ۲۵/بی گلبرگ ۲ لاہور

قیمت فی پرچہ
۳
تین روپے

جلد ۳۳ | اگست سنہ ۱۹۸۰ء | شمارہ ۸

فہرست

۱- ایسا کہاں سے لاؤں کہ تجھ سا کہیں جسے !.... ۲
(محترم پرویز صاحب)
۲- لمعات ۳
۳- رابطۂ باہمی ۹
۴- جو بادہ کش تھے پرانے وہ اٹھتے جاتے ہیں... ۱۰
(محترم پرویز صاحب)
۵- باب المراسلات ۱۱
(۱) سود کسے کہتے ہیں؟
(۲) سود کی آمدنی سے خیرات دینا کیسا ہے؟
(۳) زکوٰۃ کا قرآنی مفہوم کیا ہے؟
(۴) زکوٰۃ کے نصاب شرح اور مصارف کے متعلق قرآن کا حکم کیا ہے؟
(۵) اسلامی اور مغربی جمہوریت میں کیا فرق ہے؟
(۶) تھیاکریسی کسے کہتے ہیں؟
(۷) پندرھویں صدی ہجری کی خصوصیت کیا ہے؟
(۸) بیت المال سے کیا مراد ہے؟
۶- اسلام میں توسیعِ فکر کی اہمیت !.......... ۱۳
محترم پرویز صاحب
۷- روزوں کا مقصد ۲۵
(محترم پرویز صاحب کا ایک درس قرآن مجید)
۸- پیامِ عید .... (قرآن کی عظمت) ۳۴
۹- فہرست معطیان قرآنک ایجوکیشن سوسائٹی ۴۹
۱۰- سرمایہ داروں کا انجام ۵۰
(محترم پرویز صاحب)

ایڈیٹر محمد شفیق - ناشر سراج الحق - مقامِ اشاعت ۲۵/بی گلبرگ ۲ لاہور - پرنٹر شیخ نیاز احمد - مطبوعہ علمی پرنٹنگ پریس ۷ ارسپتال روڈ - لاہور

ایسا کہاں سے لاؤں کہ تجھ سا کہیں جسے!

طلوعِ اسلام کی کنونشنوں میں شریک ہونے والے احباب بھولنے کو اور سب کچھ بھول سکتے ہیں لیکن وہ اس پیکرِ حرکت و حرارت اور مجسمۂ خلوص و ایثار کو کبھی نہیں بھول سکتے جو اس اجتماع میں یوں رواں دواں نظر آتا تھا جیسے رگِ جاں میں خونِ زندگی موجزن ——— گرم جوش ۔ بلند نگاہ ۔ روشن دماغ ۔ شائستہ ذوق ۔ پاکیزہ سیرت ۔ مجاہدانہ کردار ——— کنونشن میں اڑھائی تین سو کے قریب مہمان، اور تین چار دنوں پر پھیلی ہوئی تقریب، جس کے مہمان نوازی کے فرائض یہ اکیلے سرانجام دیتے تھے۔ کیا مجال جو کسی کو ذرا بھی شکایت کا موقع مل جائے۔ جب دیکھئے لبوں پر مسکراہٹ، ماتھے پر بشاشت، چہرہ پر شگفتگی، مزاج میں شادابی، نگاہ میں کشادگی، نظر بظاہر ایک فرہاد کوہکن، لیکن سینے کے اندر جھانک کر دیکھئے تو ایسی نرم و نازک اور صاف و شفاف شخصیت جیسے قلب کوہسار میں کوئی حسین چشمہ نغمہ بار ہو۔ اس کی یہ گرم جوشیاں اور حرارت خیزیاں اجتماعاتِ کنونشن تک محدود نہ تھیں۔ تحریکِ قرآنی کے راستے میں جب بھی کوئی ہمت طلب، مشکل مقام آتا، وہ رضاکارانہ طور پر آگے بڑھتا اور اس مہم کو اس طرح خاموشی سے سر کر دیتا کہ ——— نہ ستائش کی تمنا نہ صلہ کی امید۔

یہ تھے اس قافلۂ قرآنی کے میرِ سامان ہمارے رشید صاحب! ملکی حالات کی ناسازگاری کی وجہ سے تین سال سے کنونشن کا انعقاد نہ ہو سکا جس کا انہیں بے حد قلق تھا۔ اس سال وہ کہتے تھے کہ کچھ بھی ہو، کنونشن ضرور منعقد ہوگی لیکن قبل اس کے کہ وہ کنونشن کیلئے احباب کو بلاتے انہیں خود ہی بارگاہِ خداوندی سے بلاوا آ گیا اور وہ ۲۶/۲۷ جون کی درمیانی شب ہم سب کو اشک فشاں اور نالہ کناں چھوڑ کر چل دیئے۔

تاباں تھیں جن سے غمکدۂ جاں کی وسعتیں، پلکوں پہ وہ چراغ سرِ شام بجھ گئے

انہوں نے بے ہوشی کے عالم میں اپنی جان، جان آفریں کے سپرد کی۔ اگر وہ ہوش میں ہوتے تو فرشتۂ اجل سے یقیناً کہتے کہ مجھے ابھی مرنے کی فرصت نہیں۔ میں نے ہنوز قرآنی کالج اپنے ہاتھوں سے بنانا ہے۔ میری بے وقت موت سے "باباجی" تنہا رہ جائیں گے۔ انہیں ابھی میری بڑی ضرورت ہے۔

میرے غمگسار! تم فرشتۂ اجل سے بالکل صحیح کہتے کہ باباجی کو ابھی میری بڑی ضرورت ہے۔ میں واقعی ایک مخلص رفیق سے محروم ہو گیا۔ اب میں ہوں اور تمہاری یاد!

شمع بجھتی ہے تو اس میں سے دھواں اٹھتا ہے
شعلۂ عشق سیاہ پوش ہوا تیرے بعد

احباب آپ کو ڈھونڈھیں گے لیکن نہ پائیں گے۔ رفقائے کارواں بیشک میرے شریکِ سفر ہوں گے (خدا انہیں تا دیر سلامت رکھے) لیکن۔

ایسا کہاں سے لاؤں کہ تجھ سا کہیں جسے!

جاؤ میرے مونس و غمخوار جاؤ! خدا کے سحابِ کرم کی رحمتیں تم پر سایہ فگن ہوں اور جنت کی فضائیں اس تمہید جانفزا سے تمہارا استقبال کریں کہ سلامٌ۔ طبتم۔ فادخلوھا۔

مثلِ ایوانِ سحر مرقد فروزاں ہو ترا
نور سے معمور یہ خاکی شبستاں ہو ترا

جگر فگار ——— پرویز

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ○

لمعات

طلوعِ اسلام کا مشن یہ ہے۔ یعنی اس نے اپنے اوپر یہ فریضہ عائد کر رکھا ہے کہ وہ قرآنِ کریم کی تعلیم اور اس کے پیغامات کو قوم کے سامنے پیش کرے۔ یہ فریضہ درحقیقت خدا کی طرف سے اُمتِ مسلمہ پر عائد ہوتا ہے۔ اس لئے طلوعِ اسلام کا یہ مشن فریضۂ خداوندی کی ادائیگی کا دوسرا نام ہے۔ اس فریضہ کی ادائیگی جہاں اپنے اندر اس قدر اہمیت رکھتی ہے وہاں یہ بیحد نازک اور پُرازخطرات بھی ہے۔ یہ (عرفِ عام میں) وہ پلصراط ہے جو "تلوار سے تیز اور بال سے باریک ہے" اگر اس میں ذرا سی لغزش ہو جائے تو انسان سیدھا جہنم کے گڑھے میں جا گرتا ہے۔ بتیانِ حقیقت کی استعداد اور استطاعت رکھتے ہوئے اگر اس میں کوتاہی یا تغافل برتا جائے تو یہ وہ کتمانِ حقیقت ہوگا جو بارگاہِ خداوندی میں سنگین جرم ہے۔ اور اگر اس کے اظہار میں ذرا سی مداہنت برتی جائے ـــــ یعنی کسی کی رعایت دامنگیر ہو جائے یا کسی کی مخالفت یا عصبیت اثر انداز ہو تو یہ اس سے بھی زیادہ سنگین جرم ہوگا۔ طلوعِ اسلام نے ہمیشہ کوشش کی ہے کہ وہ ان جرائم کا مرتکب نہ ہونے پائے۔ اس کا تعلق نہ کسی مذہبی فرقے سے ہے نہ کسی سیاسی پارٹی سے۔ نہ ہی اس نے اپنا کوئی الگ فرقہ بنایا ہے نہ سیاسی پارٹی قائم کی ہے۔ یہ عملی سیاسیات میں حصہ ہی نہیں لیتا۔ اس کا مسلک یہ ہے کہ قوم کے سامنے کوئی معاملہ پیش ہو، یہ کسی قسم کی رُو رعایت یا خوف اور جھجک کے بغیر بتائے کہ اس باب میں خدا کی کتاب کا حکم یا راہ نمائی کیا ہے۔ اس کا یہی مسلک شروع سے آج تک چلا آ رہا ہے کہ ؎

ہزار خوف ہو لیکن زباں ہو دل کی رفیق　　　یہی رہا ہے ازل سے قلندروں کا طریق

آجکل ملک میں یہ سوال بڑی شدت اور کثرت سے زیرِ بحث ہے کہ پاکستان میں اسلامی نظامِ حکومت کی شکل کیا ہوگی اور طریقِ انتخاب کس قسم کا۔ اس پر مختلف گوشوں اور طبقوں کی طرف سے اظہارِ خیال ہو رہا ہے اور کہا جاتا ہے کہ یہ سنسر کی پابندی سے مستثنیٰ ہے۔ اس سلسلہ میں قارئین کی طرف سے ہمیں بکثرت استفسارات موصول ہوئے ہیں۔ ہم نے مناسب سمجھا ہے کہ ان استفسارات کو سامنے رکھ کر اصولی طور پر واضح کر دیا جائے کہ قرآنِ کریم اس باب میں کیا راہ نمائی دیتا ہے۔

سب سے پہلے مشترکہ طور پر یہ سوال پوچھا جاتا ہے کہ کوئی عقیدہ۔ کوئی مسلک۔ کوئی نظام۔ کوئی قانون۔ اسلامی کب کہلا سکتا ہے؟ اس موضوع پر ہم اس سے پہلے متعدد بار لکھ چکے ہیں۔ اب مختصر الفاظ میں اس کی تجزیہ کی جاتی ہے۔

کسی عدالت میں ایک مقدمہ پیش ہے۔ وکیل صفائی کہتا ہے کہ مدعی کا دعویٰ خلافِ قانون ہے۔ عدالت کی طرف سے کہا جاتا ہے کہ اس قانون کا حوالہ دیجئے جس کے خلاف مدعی کا دعویٰ ہے۔ وکیلِ صفائی پاکستان کا ضابطہ فوجداری اٹھاتا ہے اور اس میں صفحہ نمبر اور آرٹیکل کا حوالہ دیتے ہوئے متعلقہ قانون کے الفاظ پڑھ دیتا ہے۔ عدالت اپنا اطمینان کر لیتی ہے کہ قانون کا صحیح حوالہ دیا گیا ہے۔ اگر وہ وکیل کسی قانون کا حوالہ نہ دے سکے یا حکومت کی طرف سے مستند ضابطہ کے سوا کسی اور قانون کا حوالہ دے، تو اس کا دعویٰ باطل قرار پا جائے گا۔

یہ نظریہ اسلامی ہے۔ یہ قانون اسلامی ہے۔ یہ مملکت اسلامی ہے۔ یہ، اور اس قسم کے دیگر دعاوی ایسے ہیں جن کے اسلامی ہونے کی سند میں مستند حوالے پیش کئے جانے ضروری ہیں۔ لیکن جائے تاسف ہی نہیں، مقامِ حیرت بھی ہے کہ اس قدر اہم دعاوی کے ثبوت کے لئے، جن کا بنیادی تعلق ہماری اس زندگی ہی سے نہیں، آخرت کی زندگی سے بھی ہے، نہ کوئی کسی سند کے پیش کرنے کی ضرورت سمجھتا ہے، نہ کوئی اس قسم کا دعویٰ کرنے والے سے سند کا مطالبہ کرتا ہے۔ یہی ہماری تمام خرابیوں اور تباہیوں کی جڑ ہے اور ہماری ناکامیوں، نامرادیوں کی علت العلل ـــ اسی سے قوم میں اس قدر اختلاف اور انتشار ہے اور اسی وجہ سے ہماری گاڑی ایک قدم بھی آگے نہیں چل سکی۔ پاکستان کی تیس سالہ تاریخ اس کی زندہ شہادت ہے۔

اس کے ساتھ اس حقیقت کو بھی سامنے رکھئے کہ اس سند کے معلوم کرنے میں کسی قسم کی دقت نہیں۔ یہ ہمارے سامنے رکھی ہے۔ جس خدا نے اسلام کو ہمارے لئے بطور دین (نظامِ حیات) منتخب کیا تھا، اس نے یہ سند بھی عطا کر دی تھی۔ اس نے واضح الفاظ میں کہہ دیا تھا کہ

وَمَن لَّمْ يَحْكُم بِمَا أَنزَلَ اللَّهُ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْكَافِرُونَ (۵/۴۴)

جو لوگ منزل من اللہ (کتاب خداوندی) کے مطابق فیصلے نہیں کرتے انہی کو کافر کہا جاتا ہے۔

یعنی جس دعویٰ کے ساتھ خدا کی کتاب کی سند پیش کی جائے وہ اسلامی ہے، اور جس کے ساتھ اس کی سند نہ ہو وہ اسلامی نہیں کہلا سکے گا۔ خدا نے صرف اپنی کتاب کو سند قرار دیا ہے۔ اس لئے اس کے سوا کوئی سند کسی دعویٰ کو اسلامی نہیں بنا سکتی لہٰذا، جو شخص کسی عقیدہ، نظریہ، مسلک، قانون یا مملکت کے اسلامی ہونے کا دعویٰ کرتا ہے، اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ اپنے دعویٰ کی تائید میں قرآن مجید سے سند پیش کرے۔ اگر وہ ایسا نہیں کرتا تو اس کا دعویٰ باطل ہے۔ جو لوگ مسلمان کی زندگی جینا چاہتے ہیں ان کے لئے بھی ضروری ہے کہ وہ ایسا دعویٰ کرنے والوں سے قرآنی سند کا مطالبہ کریں، اور اس کے سوا کسی سند (اتھارٹی) کو قابلِ قبول تصور نہ کریں ـــ آپ نے دیکھا کہ (بظاہر) اتنے بڑے مشکل سوال کا جواب کس قدر آسان ہے۔

(۰)

اس کے بعد آگے بڑھئے۔ ایک غیر اسلامی معاشرہ میں، یہ سوالات کہ اسلامی نظامِ حکومت کس قسم کا ہوگا اور اسلامی طریق کو نسا، نظری بحثوں سے زیادہ کچھ حیثیت نہیں رکھتے۔ اس لئے کہ اسلامی نظام، اسلامی معاشرہ میں قائم ہوتا ہے، نہ کہ غیر اسلامی معاشرہ میں۔ اسے بھی سمجھ لینا ضروری ہے کہ اسلامی معاشرہ کوئی مشینری نہیں جسے باہر سے

درآمد کر کے نصب کر لیا جائے۔ نہ ہی چند فقہی قوانین کے نافذ کر دینے سے معاشرہ اسلامی ہو سکتا ہے۔ معاشرہ افراد کے مجموعہ کا نام ہے، اور اسلامی معاشرہ سے مراد ہوتی ہے اُن افراد کا مجموعہ جن کی سیرت و کردار اسلامی ہو۔ غیر اسلامی معاشرہ میں اسلامی نظام سے متعلق بحث و تمحیص کی مثال یوں سمجھئے جیسے کسی گاؤں میں جہاں نہ ہسپتال ہو اور نہ ہی کوئی ڈاکٹر، گاؤں والے اس بحث میں اُلجھ رہے ہوں کہ مریض کے گردے کا اپریشن کس دن کرایا جائے۔ اپریشن کا سوال اُس وقت سامنے آئے گا جب وہاں ڈاکٹر موجود ہوں۔ ہمارے ہاں ڈاکٹروں کے بغیر اپریشن کی تفصیلات طے کرنے میں وقت اور توانائی صرف (بلکہ ضائع) کی جا رہی ہے۔ اور ہر ایک کو اعتراف ہے کہ ہمارا معاشرہ اسلامی نہیں۔ لہٰذا پہلا سوال یا مرحلہ اس غیر اسلامی معاشرہ کو اسلامی بنانے کا ہے، نہ کہ اسلامی نظام کی جزئیات اور تفصیلات طے کرنے کا۔ غیر اسلامی معاشرہ کو اسلامی بنانے کے لئے قرآن کریم ایک متعین پروگرام دیتا ہے۔ اس پروگرام پر عمل پیرا ہو کر حضور نبی اکرم نے پہلے اپنے معاشرہ کے افراد کو اسلامی بنایا تھا اور اس کے بعد اُن کے ہاتھوں اسلامی نظام قائم کرایا تھا۔ آج جو قوم بھی اپنے ہاں اسلامی نظام قائم کرنا چاہتی ہے اسے اسی پروگرام پر عمل پیرا ہونا پڑے گا۔ اس کے سوا نہ اور کوئی پروگرام ہے اور نہ ہی کوئی ------ (SHORT-CUT)

اس پروگرام کی پہلی شرط یہ ہے کہ وہ انسان "زندہ" ہوں۔ مردہ نہ ہوں۔ مردہ انسانوں میں یہ نظام قائم نہیں ہو سکتا۔ سورۂ یٰسین میں ہے:-

اِنْ هُوَ اِلَّا ذِكْرٌ وَّ قُرْاٰنٌ مُّبِيْنٌ لِّيُنْذِرَ مَنْ كَانَ حَيًّا... (۳۶/۶۹-۷۰)

یہ واضح کتاب، قرآنِ مبین، فراموش کردہ حقیقتوں کی یاد دہانی کرانے کے لئے دیا گیا ہے۔ تاکہ (یہ رسول) ان لوگوں کو جو زندہ ہیں، زندگی کی خطرناک گھاٹیوں سے آگاہ کرے۔

اقبالؒ کے الفاظ میں:-

نگاہِ عشق دلِ زندہ کی تلاش میں ہے شکارِ مردہ سزاوارِ شاہباز نہیں

دوسرے مقام پر اس پورے پروگرام کی وضاحت ان الفاظ میں کر دی:-

اَوَمَنْ كَانَ مَيْتًا فَاَحْيَيْنٰهُ وَجَعَلْنَا لَهٗ نُوْرًا يَّمْشِيْ بِهٖ فِي النَّاسِ (۶/۱۲۲)

کیا وہ جو مردہ تھا۔ پھر اسے ہم نے زندہ کیا۔ اور اس کے ہاتھ میں شمعِ قرآنی دی کہ وہ (اپنے راستے بھی روشن کرے اور) عالمگیر انسانیت کی بھی راہ نمائی کرے..... (کیا ایسی قوم اس قوم کے برابر ہو سکتی ہے جس کی کیفیت یہ ہو کہ..... آیت کا یہ حصہ بعد میں سامنے لایا جائے گا۔)

اس آیۂ جلیلہ میں اسلامی معاشرہ اور نظام کی تعمیر کی مختلف کڑیاں سامنے لائی گئی ہیں۔ رسولؐ کی بعثت کے وقت اس کی مخاطب قوم وہ ہوتی ہے جو زندگی اور اس کی حرارتوں سے محروم ہو چکی ہوتی ہے۔ وہ زندوں کی بستی نہیں، مردوں کا قریہ (قبرستان) ہوتی ہے۔ رسولؐ کے پروگرام کا پہلا مرحلہ یہ ہوتا ہے کہ وہ اس مردوں کی بستی میں صورِ اسرافیل پھونک کر ان میں زندگی کی حرارت پیدا کر دے۔ ظاہر

ہے کہ یہاں مُردوں سے مراد وہ انسان نہیں جو طبیعی طور پہ مر چکے ہوں۔ وہ لوگ طبیعی طور پر زندہ ہوتے ہیں۔ سانس لیتے ہیں۔ چلتے پھرتے ہیں۔ لیکن ان کی یہ زندگی حیوانی سطح کی ہوتی ہے۔ انسانی سطح کی نہیں۔ قرآن اس سطحِ زندگی کو کفر سے تعبیر کرتا ہے۔ اور کفر کی زندگی اس کے نزدیک موت ہے۔ فرمایا۔

وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا يَتَمَتَّعُوْنَ وَيَاْكُلُوْنَ كَمَا تَاْكُلُ الْاَنْعَامُ وَالنَّارُ مَثْوًى لَّهُمْ (۴۷/۱۲)

کفر کی زندگی حیوانی سطح کی زندگی ہے جس میں مقصدِ حیات، طبیعی سامانِ زندگی سے متمتع ہونا۔ کھانا، پینا، افزائشِ نسل کرنا اور مر جانا ہوتا ہے۔ یہ جہنم کی زندگی ہے۔

رسول اپنی بے مثال تعلیم و تربیت سے ان لوگوں کو انسانی زندگی سے متعارف کراتا ہے۔ حیوانی سطحِ زندگی میں مقصدِ حیات محض طبیعی زیست ہوتا ہے۔ اس میں اقدار (VALUES) کا تصور نہیں ہوتا۔ انسانی زندگی کا مقصد اقدارِ خداوندی کے مطابق زندگی بسر کرنا ہوتا ہے۔ اقدارِ خداوندی کے مطابق انسانی زندگی کی خصوصیات اور امتیازات کی فہرست تو طویل ہے لیکن ملخص اس کا وہ ہے جسے اقبالؒ نے "حیاتِ باشرف" کی جامع اور حسین اصطلاح سے تعبیر کیا ہے۔ اس نے کہا ہے ؎

کھول کے کیا بیاں کروں سرِّ مقامِ مرگ و عشق
عشق ہے مرگِ باشرف، مرگ حیاتِ بے شرف

شرف و تکریم انسانیت سے محروم اور بیگانہ زندگی، حیوانی سطح کی زندگی ہے۔ انسانی سطح، حیاتِ باشرف کا نام ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انسان (بنی آدم) کو سب سے بڑا امتیاز، شرف اور تکریم عطا فرمایا ہے۔ وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيْٓ اٰدَمَ (۱۷/۷۰) "ہم نے ہر انسانی بچہ کو، محض انسان ہونے کی جہت سے، واجب التکریم پیدا کیا ہے"۔ شرف و تکریم انسانیت سے مراد یہ ہے کہ کوئی انسان نہ کسی دوسرے انسان کا محتاج ہو نہ محکوم۔ کسی انسان کا دوسرے انسان کا محتاج و محکوم ہونا۔ یا اس کے مقاصد کے حصول کا آلہ کار بننا تذلیلِ انسانیت ہے اور جس معاشرہ میں کسی ایک فرد کو بھی ذلیل سمجھا یا ذلیل کیا جائے، وہ معاشرہ انسانی نہیں، حیوانی ہے۔ اسلامی نہیں کافرانہ ہے۔ اقدارِ خداوندی اسی شرف و تکریم آدمیت کے تحفظ کا ذریعہ ہیں —

رسول اپنی مخاطب مردہ قوم میں، یہی روح پھونکتا ہے اور جو افراد، انسانی سطح پر زندگی بسر کرنے کے متمنّی ہوتے ہیں، وہ اپنے سابقہ معاشرہ سے الگ ہو کر ایک نیا معاشرہ تعمیر کرتے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہوتے ہیں جن کے ہاتھ میں قرآن کی نورانی شمع دی جاتی ہے۔ یہ اسلامی نظام کے (FIRST CRYSTALS) بنتے ہیں۔

آپ نبی اکرمؐ کے اختیار فرمودہ پروگرام پر نگاہ ڈالیئے۔ آپ کی بعثت کے وقت آپ کی مخاطب قوم زندہ نہیں مردہ تھی۔ وہ حیوانی سطح پر زندگی بسر کرتی تھی۔ ان کے سامنے اقدارِ خداوندی نہیں تھیں۔ حضورؐ نے اپنی حیاتِ رسالت کا پچاس فی صد سے بھی زیادہ حصہ (تیئیس برس میں سے تیرہ برس) ان مردہ انسانوں کو زندہ انسانوں کی صف میں لانے کے لئے صرف فرما دیا۔ آپ نے اس (قدیم) معاشرہ میں اسلامی نظام کی بات ہی نہیں کی۔ آپؐ نے اپنی مکی زندگی میں، نہ اسلامی آئین مرتب فرمایا۔ نہ اسلامی قوانینِ حکومت مدوّن کئے، حالانکہ اسلامی نظام کا قیام آپؐ کی رسالت کی غایت اور آپ کے مشن کا منتہیٰ تھا—

آپؐ نے پہلے وہ افراد تیار کئے جن کے ہاتھوں اسلامی نظام قائم ہونا تھا۔ آپ نے "عمر ابن خطاب" کو اس کی (قدیم) سطح پر رہتے ہوئے، فاروق اعظمؓ نہیں بنا دیا تھا۔ آپؐ نے پہلے اسے دعائیں مانگ مانگ کر، مُردوں کی بستی سے نکالا کیونکہ آپؐ نے دیکھ لیا تھا کہ اس میں زندہ رہنے کی صلاحیت ہے۔ اس کے بعد قرآنی تعلیم و تربیت سے، (عمر ابن خطابؓ اور ان جیسے دیگر افراد) کے نہاں خانۂ دل و دماغ کو تمام سابقہ معتقدات و نظریات سے پاک و صاف کیا۔ (یہ حصہ لَا تھا) اور اس کے بعد اس خالی گھر میں "اللہ کو بسایا" (یہ حصہ اِلَّا تھا)۔ یہ تھا اس پروگرام کا مرحلہ اول ـــ اقبالؒ کے الفاظ میں: ؎

پہلے اپنے پیکرِ خاکی میں جاں پیدا کرے | ہو صداقت کے لئے جس دل میں مرنے کی تڑپ!
اور خاکستر سے آپ اپنا جہاں پیدا کرے | پھونک ڈالے یہ زمین و آسمانِ مستعار

حضور نبی اکرمؐ کو اللہ تعالیٰ نے المزمّل کہہ کر پکارا تھا۔ مزمّل اس کارواں سالار کو کہتے ہیں جو بہترین افرادِ کارواں کا انتخاب کرے۔ حضورؐ کی مکی زندگی، ان افرادِ کارواں کی تیاری میں گزری۔ (جیسا کہ اوپر کہا گیا ہے) اس دور میں آپ نے اسلامی مملکت اور اس کے تقضمنات کے متعلق کوئی تفصیلات طے نہیں فرمائیں۔ حالانکہ آپ کی تمام سعی و کاوش کا منتہیٰ وہی تھا۔ اس وقت آپ نے ساری توجہ اپنے رفقائے کار کی تعمیر کی طرف مرکوز رکھی، کہ یہی منزل تک پہنچنے کا صحیح پروگرام تھا۔ (پھر اقبالؒ ہی کے الفاظ میں): ؎

من از طریق نہ پرسم، رفیق می جویم! | کہ گفتہ اند، نخستین رفیق، بعد طریق

ان رفقا کے ہاتھ میں جب قرآن دیا تو پھر نہ اسلامی نظام و مملکت کے قیام میں کوئی دِقّت پیش آئی نہ طریقِ انتخاب و مشاورت کی کوئی بحث اٹھی۔

قرآنِ کریم نے واضح الفاظ میں کہہ دیا ہے کہ کسی قوم کے خارجی حالات میں کوئی تبدیلی پیدا نہیں ہو سکتی جب تک اس قوم کے افراد میں نفسیاتی تبدیلی نہ آچکی ہو۔ حضورؐ کے تعمیر کردہ معاشرہ کے افراد میں کس قسم کی داخلی (نفسیاتی) تبدیلی آچکی تھی، اسے قرآنِ کریم نے بڑے بسیط انداز میں بیان فرمایا ہے۔ ارشاد ہے۔ فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُونَ حَتَّىٰ يُحَكِّمُوكَ فِيمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ "اے رسولؐ! تیرا رب اس پر شاہد ہے۔ اس کی گواہی دیتا ہے کہ یہ لوگ کبھی مومن نہیں ہو سکتے، جب تک یہ اپنے تمام اختلافی معاملات میں تمہیں اپنا حَکَم (فیصلہ دینے والا) مقرر نہ کریں۔ جہانتک کسی نفسیاتی تغیر کی ضرورت نہیں۔ ایسا کچھ ہر حکومت قانون کی رُو سے کرا سکتی ہے۔ یعنی اختلافی معاملات کا فیصلہ حکومت کریگی۔ نفسیاتی تغیر کی بات آگے آتی ہے۔ فرمایا کہ یہ لوگ اپنے خلافی معاملات تیرے پاس لائیں۔ تو فیصلہ دے تو ان کی کیفیت یہ ہو کہ ثُمَّ لَا يَجِدُوا فِي أَنفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ "یہ تیرے فیصلے کے خلاف، دل کی گہرائیوں میں بھی کوئی کبیدگی اور گرانی محسوس نہ کریں۔" یہ بات داخلی تبدیلی (نفسیاتی تغیر) کے بغیر ممکن نہیں۔ (۴/۶۵)

یہ تھے وہ افراد جنہیں اس عظیم ذمہ داری (قیامِ نظامِ اسلامی) کے لئے تیار کیا گیا تھا۔ ان کی قلبی

کیفیت اس قسم کی کیوں ہو گئی تھی۔ بات واضح ہے۔ ان سے کہا گیا کہ اپنے تمام اختلافی معاملات کے تصفیہ کے لئے حضورؐ کی طرف رجوع کریں، تو دوسری طرف حضورؐ سے فرمایا کہ

فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ وَلَا تَتَّبِعْ اَهْوَآءَهُمْ ..... (۵/۴۸)

"تم ان کے معاملات کا فیصلہ کتاب اللہ کے مطابق کیا کرو اور اس میں کسی کے جذبات کی رعایت نہ کرو۔"

یعنی فیصلے اس کتاب اللہ کے مطابق جس کی صداقت پر ان کا ایمان ہے اور فیصلہ دینے والا وہ جس کی، پاکیزگیٔ سیرت ان کے لئے اسوۂ حسنہ ہے۔ اور اُسے بھی یہ تاکید کہ فیصلہ دیتے ہیں، نہ اپنے، نہ کسی اور کے جذبات سے متاثر ہو۔ یہ تھا وہ معاشرہ جس میں اسلامی نظام قائم ہوا تھا۔

یہیں سے ایک قدم آگے بڑھ جائیے تاکہ اس اہم سوال کا جواب بھی لگے ہاتھوں مل جائے جس کا تعلق نظام معاشرت سے ہے۔ سربراہِ مملکت اور ان افراد معاشرہ کے باہمی تعلق کی بابت ہم دیکھ چکے ہیں کہ اگر اس کے کسی فیصلہ کے خلاف ان کے دل کی گہرائیوں میں بھی کسی قسم کی کبیدگی یا گرانی پیدا ہو جائے تو یہ اپنے آپ کو مومن نہیں تصور کر سکتے۔ لیکن اسی سربراہِ مملکت کو حکم دیا جاتا ہے کہ وَشَاوِرْهُمْ فِي الْاَمْرِ (۳/۱۵۹) "امورِ مملکت میں ان سے مشورہ کیا کرو"۔ اور اس مشورہ میں انہیں اس قدر آزادیٔ رائے حاصل تھی کہ وہ حضورؐ کی پیش کردہ تجاویز کی مخالفت کرنے میں بھی کوئی باک نہیں سمجھتے تھے۔ اور حضورؐ کی کشادہ نگہی کا یہ عالم تھا کہ اگر ان کی رائے زیادہ صائب ہوتی، تو آپ اپنی تجویز میں اس کے مطابق تبدیلی فرما دیتے۔ اور جب کسی معاملہ کے متعلق فیصلہ ہو جاتا تو پھر اس فیصلہ کی تعمیل میں کسی کے دل کی گہرائیوں میں بھی کسی قسم کی گرانی پیدا نہیں ہوتی تھی۔ اس نظام میں نہ حکم دینے والے کی طرف سے کسی قسم کے جبر کا امکان تھا، نہ حکم ماننے والوں کے دل میں کسی قسم کی مجبوری کا احساس۔ یہ ہے اسلامی نظام کی وہ انفرادیت جس کی مثال دنیا کا کوئی نظام پیش نہیں کر سکتا۔ انسانی نظام خارج سے مسلط کیا جاتا ہے۔ اسلامی نظام دل کی گہرائیوں سے اُبھر کر باہر آتا ہے۔

یہ تھا پروگرام اسلامی نظام قائم کرنے کا۔ اس کے برعکس، ہماری کیا حالت ہے، اس کے متعلق اس آیت کے اگلے حصہ کو سامنے لائیے جس کا حصہ اوّل پہلے درج کیا جا چکا ہے۔ پوری آیت یوں ہے:۔

اَوَمَنْ كَانَ مَيْتًا فَاَحْيَيْنٰهُ وَجَعَلْنَا لَهٗ نُوْرًا يَّمْشِيْ بِهٖ فِي النَّاسِ كَمَنْ مَّثَلُهٗ فِي الظُّلُمٰتِ لَيْسَ بِخَارِجٍ مِّنْهَا ۔ كَذٰلِكَ زُيِّنَ لِلْكٰفِرِيْنَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ (۶/۱۲۳)

کیا وہ شخص جو مردہ تھا۔ پھر اسے ہم نے زندہ کیا۔ پھر اس کے ہاتھ میں نورانی شمع دی کہ وہ نوعِ انسانی کے راستوں کو روشن کرے۔ اس شخص کی مانند ہو سکتا ہے جو تاریکیوں میں زندگی بسر کر رہا ہو اور ان تاریکیوں سے نکلنا بھی نہ چاہے۔ ضابطۂ خداوندی کو اپنا حکم نہ بنانے والوں کے اعمال اس طرح ان کی نگاہوں میں بڑے خوشنما بنا کر دکھائی دیتے ہیں۔

قرآنِ مجید کے خلاف جس قدر معتقدات، نظریات، مسالک و مشارب، رسوم و رواج اور قوانین و احکام ہیں، سب تاریکیاں ہیں۔ خواہ ان کا نام کچھ ہی کیوں نہ رکھ لیا جائے (روشنی صرف قرآن ہے) ہم ان تاریکیوں میں زندگی بسر کرتے چلے آ رہے تھے۔ ہم نے پاکستان کو اسی لئے متشکل کیا تھا کہ ہم ان تاریکیوں سے نکل کر قرآنی روشنی میں آجائیں۔ پہلے خود اس روشنی میں آئیں اور اس کے بعد اس شمع آسمانی سے عالمگیر انسانیت کے راستے روشن کریں۔

جہاں تک قوانین سازی کا تعلق ہے ہماری مملکت آزاد ہے اور قانون سازی کا کلی اختیار رکھتی ہے۔ یہ مملکت جس قسم کے قوانین مناسب سمجھے نافذ کرے۔ اس پر کسی کو کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔ لیکن جب ان قوانین و احکام کو جن کے ساتھ قرآن کی سند نہیں، اسلامی کہہ کر نافذ کیا جائے تو ان تاریکیوں کے پردے بہت گہرے اور مستحکم ہو جاتے ہیں۔ نوجوان نسل اسلام سے برگشتہ ہو جاتی ہے، ہو رہی ہے اور غیر قوموں کی نگاہوں میں اسلام بدنام ہو جاتا ہے۔

بہرحال ہم نے ان تصریحات کو ضروری سمجھا ہے۔ ایک تو اس لئے کہ یہ وہ فریضۂ خداوندی ہے جس کی ادائیگی ہم پر واجب ہے۔ دوسرے اس لئے کہ صدرِ مملکت نے خود ان خیالات کے اظہار کی دعوت دی ہے۔ اور تیسرے اس لئے کہ اگر انہیں درخورِ اعتنا نہ بھی سمجھا گیا تو کم از کم آنے والا مؤرخ اتنا تو دیکھ سکے گا کہ کسی نے ان کے غیر قرآنی، فلہٰذا غیر اسلامی ہونے کا اظہار کیا تھا۔

آخر میں پھر دہرا دیا جائے کہ کسی قانون کے اسلامی ہونے کی شرط یہ ہے کہ اسے قرآن کریم کی سند حاصل ہو اور اسلامی معاشرہ ان افراد کے ہاتھوں قائم ہوتا ہے جن کی سیرت و کردار اسلامی ہو۔ یعنی وہ قرآنی معیار پر پورے اتریں۔ واللہ علیٰ ما نقول شہید۔

رابطۂ باہمی

گوجرانوالہ میں بزم کا قیام

گوجرانوالہ کے قرآنی احباب، مستحقِ مبارک باد ہیں کہ انہوں نے وہاں بزمِ طلوعِ اسلام قائم کر لی ہے، اور محترم چوہدری مقبول شوکت صاحب درخورِ تبریک، جسے انہوں نے اپنا نمائندہ منتخب کیا ہے۔ ادارہ بزم کے قیام اور چوہدری صاحب موصوف کے انتخاب کی توثیق کرتا ہوا دعاگو ہے کہ ان احباب کی مساعی سے شمعِ قرآنی فکر کی شعاعیں دور دور تک پھیلیں۔ بزم کے دفتر کا پتہ حسبِ ذیل ہے جہاں بذریعہ کیسٹ، پرویز صاحب کا درسِ قرآن کریم ہوتا ہے:۔

چوہدری مقبول شوکت۔ گل روڈ۔ سول لائنز۔ بالمقابل
پرانا ریلوے اسٹیشن۔ گوجرانوالہ

(۰)

جو بادہ کش تھے پرانے وہ اُٹھتے جاتے ہیں

چوہدری حبیب احمد

بعض اتفاقات بڑے ناقابلِ فہم ہوتے ہیں۔ چوہدری حبیب احمد زندگی میں اس قدر میرے قریب رہے لیکن ان کی ناگہانی وفات کی خبر مجھے تک بڑی دیر میں پہنچی حالانکہ فیصل آباد اور لاہور کا فاصلہ کچھ اتنا زیادہ نہ تھا۔ مرحوم مجاہدینِ تحریکِ پاکستان کے السابقون الاوّلون میں سے تھے اور حصولِ پاکستان کے بعد اس خطۂ زمین کے تحفظ اور اس میں قرآنی نظام کے قیام کے والہانہ شیدائی۔ قرآن، اقبالؒ اور پاکستان کے اقنومِ ثلاثہ ان کی زندگی کے اجزا بن چکے تھے۔ ان کے خلاف کوئی اقدام تو ایک طرف، اگر کسی گوشے سے ان کی مخالفت کی ذرا سی بھنک بھی ان کے کان میں پڑ جاتی تو وہ برہنہ شمشیر کی طرح مقابلہ کے لئے کھڑے ہو جاتے۔ حق گوئی اور بیباکی ان کے کردار کا وصفِ اوّلین تھا۔ یہی وہ مشترک اقدار تھے جن کی بنا پر وہ طلوعِ اسلام کی قرآنی تحریک سے بھی ہمدردی رکھتے تھے۔ "نیشنلسٹ علماء اور تحریکِ پاکستان" اور "جماعتِ اسلامی کا رخِ کردار" ان کی یادگار تصانیف ہیں جو بیش بہا معلومات کا ذخیرہ ہیں۔ ان کی وفات سے تاریخِ پاکستان کی ایک زندہ یادگار مٹ گئی۔

خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را

(٠)

چوہدری نذیر احمد خان

تحریکِ پاکستان کی صفِ اوّل کے نبرد آزماؤں میں ایک درخشندہ نام چوہدری نذیر احمد خان کا بھی تھا۔ سو وہ بھی چل بسے۔ اس غم نصیب کے ساتھ ان کے تعلقات اُس زمانے سے تھے جب وہ ابتدائی ایام میں منٹگمری (حالیہ ساہیوال) میں پریکٹس کرتے تھے اور مجھے اس پر فخر ہے کہ یہ تعلقات عمر بھر رہے۔ مصروفیات کی وجہ سے، بالمشافہ ملاقات کے مواقع کم ملتے تھے لیکن ٹیلی فون پر سلسلۂ ہم کلامی اکثر رہتا۔ قرآن مجید، حضور نبی اکرمؐ کی ذاتِ گرامی۔ اکبر (الہ آبادی) اور اقبالؒ کے وہ فریفتہ تھے اور وحدتِ اُمت اُن کی زندگی کا مشن۔ یہی ہماری گفتگوؤں کا موضوع ہوتے۔ ان کی شخصیت، نہایت معروف اور بین الاقوامی شہرت کی حامل تھی۔ اس لئے مجھے ان کے قلب و دماغ کی اعلیٰ صلاحیتوں کے متعلق کچھ کہنے کی ضرورت نہیں، بجز اس کے کہ علامہ اقبالؒ نے مردانِ مومن کو "عشق و دلبری کا آمیزہ" کہا ہے۔ جو مرحوم کی ذات اس کا حسین پیکر تھی۔ مجھ پر ان کا ایک ذاتی احسان بھی تھا جس سے یہ حقیقت نمایاں ہوتی تھی کہ وہ کس قدر بلند پایہ انسان تھے۔ اس کا تذکرہ میں نے طلوعِ اسلام بابت جنوری ۱۹۷۱ء میں کیا تھا۔ وہ اہلِ قلم بھی تھے اور بلند پایہ تصانیف ان کی یادگار ہیں۔ اللہ تعالیٰ انہیں اپنے جوارِ رحمت میں مستقر عطا فرمائے۔

رفقاءِ سفر کا نوحہ خواں ——— پرویز

(٠)

باب المراسلات

قارئین کی طرف سے ہمیں بکثرت استفسارات موصول ہوتے رہتے ہیں۔ ان کے مراسلات طول طویل ہوتے ہیں اور وہ مفصل جواب کے متمنی بلکہ مقتضی۔ لیکن طلوعِ اسلام کی محدود ضخامت میں اس کے لئے گنجائش نہیں نکل سکتی۔ اس کے لئے قابلِ عمل صورت یہی ہے کہ ان استفسارات اور قرآن مجید کی روشنی میں ان کے جوابات نہایت مختصر الفاظ میں پیش کر دیئے جائیں۔ ذیل میں اسی طریق پر عمل کیا گیا ہے۔

۱۔ سود کسے کہتے ہیں؟

قرآن کریم کی رُو سے معاوضہ صرف محنت کا ہے۔ سرمایہ (روپے) کا نہیں۔ سرمایہ کا معاوضہ ربٰوا (سود) ہے خواہ اس کی شکل کوئی بھی ہو۔ کسی کو کچھ ذاتی قرض دیا جائے اور اصل زر سے کچھ زائد لیا جائے تو وہ ربٰوا ہے۔ کسی کاروبار میں محض روپیہ (INVEST) کر کے اس کے منافع میں شریک ہو جائے تو وہ بھی ربٰوا ہے (فقہ کی اصطلاح میں اسے مضاربت کہتے ہیں) زمین کی بٹائی یا پٹہ کا روپیہ بھی ربٰوا ہے۔ (اسے مزارعت کہا جاتا ہے) مختصراً یہ کہ اصل زر سے جو کچھ زائد لیا جائے وہ ربٰوا ہے۔ تفصیل اس کی ادارہ کی طرف سے شائع کردہ کتاب نظامِ ربوبیت میں ملیگی۔

۲۔ سود کی آمدنی سے خیرات دینا کیسا ہے؟

دوسروں کی امداد یا فلاحی امور کے لئے جو کچھ خرچ کیا جائے اس کے لئے قرآن کی اصطلاح انفاق ہے اور انفاق کے متعلق قرآن مجید کا ارشاد ہے کہ يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْفِقُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا كَسَبْتُمْ وَمِمَّآ اَخْرَجْنَا لَكُمْ مِّنَ الْاَرْضِ ..... (۲/۲۶۷) اے ایمان والو! تمہارے ہاتھوں کی کمائی ہو یا زمین کی پیداوار اس میں طیب (پاکیزہ کمائی) کا انفاق کرو۔ اس سے ظاہر ہے کہ ناجائز یا حرام کی کمائی سے انفاق فی سبیل اللہ ناجائز ہے انفاق پاک کمائی ہی سے کیا جا سکتا ہے۔

۳۔ زکوٰۃ کا قرآنی مفہوم کیا ہے؟

زکوٰۃ کے معنی ہیں سامانِ نشوونما۔ اور ایتائے زکوٰۃ کے معنی ہیں سامانِ نشوونما مہیا کرنا۔ اسلامی مملکت کا فریضہ ہے کہ وہ (اوّلاً) اپنے معاشرہ کے افراد کو سامانِ نشوونما مہیا کرے اور اس کے بعد اس سلسلہ کو وسعت دے کر عالمگیر انسانیت کو اس نظامِ ربوبیت میں شامل کر لے۔ یہی وہ ایتائے زکوٰۃ (سامانِ نشوونما مہیا کرنا) ہے جسے قرآن نے اسلامی مملکت کا فریضہ قرار دیا ہے۔ جماعت مومنین کے متعلق ارشاد ہے کہ اَلَّذِيْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِي الْاَرْضِ اَقَامُوا

اَقَامُوا الصَّلٰوۃَ وَاٰتَوُا الزَّکٰوۃَ ... (۲۲/۴۱) "یہ وہ لوگ ہیں (یعنی جماعتِ مومنین) کہ جب انہیں ملک میں اقتدار حاصل ہوگا تو یہ نظامِ صلوٰۃ قائم کریں گے اور اپنا سے زکوٰۃ کا فریضہ ادا کریں گے۔ یعنی اسلامی مملکت زکوٰۃ دے گی۔ سامانِ نشوونما مہیا کرے گی۔ مملکت کے لئے "زکوٰۃ لینے" کا کوئی ذکر قرآن میں نہیں۔

۴۔ زکوٰۃ کے نصاب، شرح اور مصارف کے متعلق قرآن کا کیا حکم ہے؟

زکوٰۃ کا جو قرآنی مفہوم اوپر بیان کیا گیا ہے اس کی رُو سے، اس کے نصاب، شرح اور مصارف کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ تمام افرادِ معاشرہ کو سامانِ نشوونما فراہم کرنا اسلامی مملکت کا فریضہ ہے۔ وہ مملکت زکوٰۃ دیتی ہے۔ لیتی نہیں۔ جنہیں ہمارے ہاں مصارفِ زکوٰۃ کہا جاتا ہے، قرآنِ کریم کی رُو سے وہ زکوٰۃ کے نہیں، صدقات کے مصارف ہیں۔ دیکھئے (۹/۶۰)

۵۔ اسلامی اور مغربی جمہوریت میں کیا فرق ہے؟

اگر اُمت، باہمی مشاورت سے، قرآن مجید کے ابدی اور غیر متبدل اصول و اقدار کے حدود کے اندر رہتے ہوئے امورِ مملکت کے فیصلے کرے تو یہ اسلامی جمہوریت ہوگی (اگرچہ مناسب یہی ہے کہ اس کے لئے جمہوریت کی اصطلاح استعمال نہ کی جائے) اور اگر ان حدود و قیود کے بغیر فیصلے کئے جائیں تو وہ مغربی جمہوریت ہوگی۔ اسے سیکولر نظامِ حکومت کہتے ہیں جو قرآنی نظام کی ضد ہے۔ دو باتیں یاد رکھئے۔ ایک تو یہ کہ اسلامی مملکت (استخلاف فی الارض) پوری کی پوری اُمت کی ہوتی ہے۔ کسی فرد یا افراد کے گروہ کا اس پر اجارہ نہیں ہوتا۔ اور مملکت پابند ہوتی ہے قرآنی حدود کی جو ابدی اور غیر متبدل ہوتی ہیں۔

۶۔ تھیاکریسی کسے کہتے ہیں؟

اگر قرآنِ مجید کے احکام و قوانین کے بجائے، انسانوں ..... کے وضع کردہ قوانین کو اسلام کے نام سے اُمت پر مسلط کر دیا جائے تو اسے تھیاکریسی کہا جائے گا۔ واضح رہے کہ ابدی اور غیر متبدل احکام و قوانین صرف قرآن مجید کے ہیں۔ انسانوں کے وضع کردہ قوانین کو ابدی اور غیر متبدل تصور کرنا، انہیں خدائی درجہ دے دیتا ہے۔ اسی لئے اسے "تھیاکریسی" کہا جاتا ہے۔

۷۔ پندرھویں صدی ہجری کی خصوصیت کیا ہے؟

اس کے متعلق نہ تو قرآن مجید میں کوئی ذکر آیا ہے، اور (جہاں تک ہماری نگاہ کام کرتی ہے) نہ ہی کسی حدیث میں اس کی اہمیت بتائی گئی ہے۔ اس کی اہمیت کی وجہ کا ہمیں علم نہیں۔

(باقی صفحہ ۳۲ پر)

اِسلام میں توسیعِ فکر کی اہمیّت

(پرویز)

پرویز صاحب طلوعِ اسلام کے سوا، اور کہیں کچھ نہیں لکھتے۔ اس لئے کہ انہیں اس کی فرصت ہی نہیں ملتی۔ لیکن پچھلے دنوں مؤقر ماہنامہ "ماہِ نو" کے مدیر محترم نے ان سے فرمائش کی کہ وہ اس ماہنامہ کی خصوصی اشاعت کے لئے جو عنقریب شائع ہوگی "اسلام میں توسیعِ فکر کی اہمیت" پر ایک مقالہ تحریر کر دیں۔ ان کا یہ مقالہ "ماہِ نو" کی خصوصی اشاعت میں شائع ہوا ہے، جسے ہم آدابِ صحافت کو ملحوظ رکھتے ہوئے، ان کے شکریہ کے ساتھ طلوعِ اسلام میں شائع کرتے ہیں۔

میرے اس مقالہ کا مجوزہ موضوع "اسلام میں توسیعِ فکر کی اہمیت" ہے لیکن میں سمجھتا ہوں کہ جب تک یہ نہ دیکھ لیا جائے کہ اسلام میں خود فکر کا کیا مقام ہے، اس کی توسیع کی اہمیت کا سوال پیدا نہیں ہوگا۔ لہٰذا، میں پہلے فکر کی اہمیت کے سوال کو لیتا ہوں اور جو کچھ میں اس ضمن میں پیش کروں گا اس کی سند قرآن مجید ہوگی، یہی میرا زندگی بھر کا معمول ہے۔

فکر کا ماحصل علم ہوتا ہے اور اسلام میں علم کی اہمیت کا اندازہ قرآن مجید کے ان چند الفاظ سے لگایا جا سکتا ہے۔ جن میں کہا گیا ہے کہ

قُلْ هَلْ يَسْتَوِي الَّذِينَ يَعْلَمُونَ وَالَّذِينَ لَا يَعْلَمُونَ ۗ إِنَّمَا يَتَذَكَّرُ أُولُو الْأَلْبَابِ (۳۹/۹)

اے رسول! ان سے کہہ دو کہ کیا اہلِ علم اور بے علم کبھی ایک جیسے ہو سکتے ہیں؟ لیکن یہ حقیقت بھی ان ہی لوگوں کی سمجھ میں آ سکے گی، جو عقل و فکر سے کام لیں

اس سے علم کی اہمیت ہمارے سامنے آ گئی۔ اس کے بعد قرآن کریم نے کہا ہے کہ انسانی علم کی کوئی حد نہیں۔ یعنی کوئی انسان، کسی زمانے میں بھی یہ نہیں کہہ سکتا کہ وہ علم کی انتہا تک پہنچ گیا ہے۔ اس عظیم حقیقت کی وضاحت کے لئے قرآن مجید میں کہا گیا ہے کہ (اور تو اور) وہ گرامی قدر ہستی (یعنی حضور نبی اکرمؐ) جو علم کی معراجِ کبریٰ پر فائز تھی وہ بھی یہ دعا کیا کرتے تھے کہ

رَبِّ زِدْنِي عِلْمًا (۲۰/۱۱۴)

اے میرے نشوونما دینے والے! میرے علم میں اضافہ فرما دے

اس کے بعد یہ سوال سامنے آتا ہے کہ قرآن مجید کی رو سے علم کا مفہوم کیا ہے؟ یعنی وہ علم کہتا کسے ہے۔ اس نے واضح الفاظ میں بتا دیا کہ علم کوئی ظنّی، قیاسی یا باطنی قسم کی شے نہیں۔ انسانی حواس خارجی کائنات سے جو معلومات

حاصل کرتے ہیں ان پر غور و فکر کے بعد انسان جس نتیجے پر پہنچتا ہے اسے علم کہا جاتا ہے' اس قسم کے فکری نتائج میں باہمی ربط یا ہم آہنگی سے کلیات مرتب ہوتے ہیں' بالفاظ دیگر (SENSE PERCEPTION) سے (CONCEPTS) مرتب کرنے کا نام علم انسانی ہے۔ سورۂ بنی اسرائیل میں ہے: وَلَا تَقْفُ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ ۚ إِنَّ السَّمْعَ وَالْبَصَرَ وَالْفُؤَادَ كُلُّ أُولٰٓئِكَ كَانَ عَنْهُ مَسْئُولًا (۱۷:۳۶)

"جس بات کا تمہیں علم نہ ہو اس کے پیچھے مت لگو۔ علم سے مراد یہ ہے کہ تم اپنی سماعت اور بصارت (حواس) کے ذریعے معلومات حاصل کرنے کے کامل غور و فکر کے بعد کسی نتیجے پر پہنچو۔ یاد رکھو! اس بات میں تم پر بہت بڑی ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔ تم سے پوچھا جائے گا کہ تم نے اس طرح علم حاصل کر لیا تھا یا یونہی کسی بات کے پیچھے لگ گئے تھے"۔

اہل علم ابھی تک حتمی طور پر متعین نہیں کر سکے کہ انسانی فکر کا مرکز کیا ہے؟ کبھی یہ کہا گیا کہ فکر کا مرکزی نظام دماغ (BRAIN) ہے کبھی اسے دل (HEART) کہہ کر پکارا گیا۔ پھر اس کے لئے (MIND) کا لفظ وضع کیا گیا لیکن اس کا بھی کوئی حتمی مفہوم متعین نہیں کیا جا سکا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ یہ اصطلاح بھی اب رفتہ رفتہ فرسودہ ہوتی چلی جا رہی ہے۔ قرآن کریم نے اس کے لئے دو الفاظ استعمال کئے ہیں ...... قلب اور فواد (ان دونوں میں کیا فرق ہے اس کی تشریح کا یہ مقام نہیں) اس وقت بتانا صرف یہ مقصود ہے کہ قرآن مجید نے کہا ہے کہ اپنے حواس کے ذریعے معلومات حاصل کرو اور پھر انہیں اپنے قلب یا فواد کے سامنے پیش کرو تاکہ وہ ان پر غور و فکر کے بعد کسی نتیجے پر پہنچ سکے۔ یہ ہے حصول علم کا فکری طریق۔ قرآن مجید نے اس فکری طریق کو کس قدر اہمیت دی ہے۔ اس کے لئے بے شمار آیات پیش کی جا سکتی ہیں۔ میں یہاں چند ایک پر اکتفا کروں گا۔ سورۃ الاعراف میں ہے:-

وَلَقَدْ ذَرَأْنَا لِجَهَنَّمَ كَثِيرًا مِّنَ الْجِنِّ وَالْإِنسِ ۖ لَهُمْ قُلُوبٌ لَّا يَفْقَهُونَ بِهَا وَلَهُمْ أَعْيُنٌ لَّا يُبْصِرُونَ بِهَا وَلَهُمْ آذَانٌ لَّا يَسْمَعُونَ بِهَا ۚ أُولٰٓئِكَ كَالْأَنْعَامِ بَلْ هُمْ أَضَلُّ ۚ أُولٰٓئِكَ هُمُ الْغَافِلُونَ (۷:۱۷۹)۔

اکثر لوگوں کی کیفیت یہ ہے —— خواہ وہ متمدن اقوام کے افراد ہوں اور خواہ جاہل بادیہ نشین —— کہ ان کی روش زندگی پکار پکار کر کہہ رہی ہوتی ہے کہ یہ جہنمی ہیں۔ یہ وہ ہیں جو سینے میں دل رکھتے ہیں لیکن اس سے سمجھنے سوچنے کا کام نہیں لیتے۔ ان کی آنکھیں بھی ہوتی ہیں لیکن ان سے دیکھنے کا کام نہیں لیتے ان کے کان بھی ہوتے ہیں لیکن وہ ان سے سننے کا کام نہیں لیتے۔ یہ انسان نہیں حیوان ہیں —— بلکہ ان سے بھی گئے گزرے (اس لئے کہ حیوان کم از کم اپنی جبلت کے مطابق تو چلتے ہیں) اور اس قسم کے انسان ان حدود کی طرف سے بھی آنکھیں بند کئے رکھتے ہیں۔

یا قرآن مجید کی رو سے جو لوگ عقل و فکر سے کام نہیں لیتے وہ اہل جہنم ہیں' اسی لئے دوسرے مقام پر کہا گیا جب مجرمین کو جہنم کی طرف لایا جائے گا تو اس کا داروغہ ان سے پوچھے گا کہ کیا تمہیں کسی نے یہ نہیں بتایا کہ سلامتی کی راہ کون سی ہے اور تباہی کا راستہ کون سا؟ وہ کہیں گے کہ یہ کچھ بتانے والے تو آئے تھے۔ لیکن ہم نے نہ گوش ہوش ان کی بات سنی نہ اس پر غور و فکر کیا:-

لَوْ كُنَّا نَسْمَعُ اَوْ نَعْقِلُ مَا كُنَّا فِيْٓ اَصْحٰبِ السَّعِيْرِ (۶۷/۱۰)

اگر ہم ان کی بات سُن لیتے اور عقل و فکر سے کام لیتے تو ہمارا شمار اہلِ جہنم کے زمرے میں کیوں ہوتا۔ آیت (۷/۱۷۹) میں عقل و فکر سے کام نہ لینے والوں کو حیوان بلکہ ان سے بھی بدتر قرار دیا گیا ہے۔ سورۂ انفال میں جماعتِ مومنین سے کہا کہ

وَلَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ قَالُوْا سَمِعْنَا وَهُمْ لَا يَسْمَعُوْنَ (۸/۲۱)

دیکھنا! تم کہیں ان لوگوں کی طرح نہ ہو جانا جو زبان سے تو کہتے ہیں کہ ہم نے پیغاماتِ خداوندی کو سُن لیا ہے لیکن وہ انہیں دل کے کانوں سے نہیں سنتے۔

یاد رکھو!

اِنَّ شَرَّ الدَّوَآبِّ عِنْدَ اللّٰهِ الصُّمُّ الْبُكْمُ الَّذِيْنَ لَا يَعْقِلُوْنَ (۸/۲۲)

قانونِ خداوندی کی رو سے بدترین خلائق وہ لوگ ہیں جو بہرے اور گونگے بنے رہتے ہیں، اور عقل و فکر سے کام نہیں لیتے۔

اسی لئے وہ کہتا ہے:-

قُلْ هَلْ يَسْتَوِي الْاَعْمٰى وَالْبَصِيْرُ اَفَلَا تَتَفَكَّرُوْنَ (۶/۵۰)

ان سے کہو کہ (مجھے بتاؤ) کیا اندھا اور آنکھوں والا برابر ہو سکتے ہیں؟ سمجھ میں نہیں آتا کہ تم لوگ ایسی کھلی ہوئی حقیقت پر بھی غور و فکر کیوں نہیں کرتے؟

ان کے برعکس وہ جماعتِ مومنین کے متعلق کہتا ہے کہ

اِنَّ فِيْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافِ الَّيْلِ وَالنَّهَارِ لَاٰيٰتٍ لِّاُولِي الْاَلْبَابِ (۳/۱۸۹)۔

حقیقت یہ ہے کہ جو لوگ عقل و بصیرت سے کام لیتے ہیں ان کے لئے تخلیقِ کائنات اور گردشِ لیل و نہار میں قوانینِ خداوندی کی محکمیت اور ہمہ گیری کی بڑی بڑی نشانیاں ہیں۔

یعنی ان اربابِ فکر و نظر کے لئے:-

اَلَّذِيْنَ يَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ قِيٰمًا وَّقُعُوْدًا وَّعَلٰى جُنُوْبِهِمْ وَيَتَفَكَّرُوْنَ فِيْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا سُبْحٰنَكَ فَقِنَا عَذَابَ النَّارِ (۳/۱۹۰)

جو زندگی کے ہر گوشے میں کھڑے، بیٹھے، لیٹے، قانونِ خداوندی کو اپنی نگاہوں کے سامنے رکھتے ہیں اور تخلیقِ کائنات پر غور و فکر کرتے رہتے ہیں اور اپنی تحقیق کے بعد علیٰ وجہ البصیرت پکار اٹھتے ہیں کہ ہمارے نشوونما دینے والے! تو نے اس کارگہِ ہستی کو نہ تو عبث اور بیکار پیدا کیا ہے اور نہ ہی تخریبی نتائج پیدا کرنے کے لئے یہ بات تجھ سے بہت بعید ہے کہ تو کسی شے کو بے مقصد اور بلا غرض و غایت یا تخریبی نتائج مرتب کرنے کے لئے پیدا کر دے (یہ ہماری کم علمی اور کوتاہ نگہی ہے کہ ہم تحقیق سے کام نہیں لیتے اور اس طرح اشیائے کائنات کے نفع بخش پہلوؤں سے بےخبر رہ کر عذاب کی زندگی بسر کرتے ہیں)۔ تو ہمیں توفیق عطا فرما کہ ہم علمی تحقیقات اور عملی تجربات

کے بعد کائناتی قوتوں سے صحیح صحیح فائدہ اُٹھائیں اور اس طرح تباہی اور بربادی سے محفوظ رہیں

☆

اسلام کے خلاف اعتراض کرنے والے اکثر کہتے ہیں کہ یہاں تک تو ٹھیک ہے کہ قرآن مجید نظامِ فطرت پر غور و فکر کی دعوت دیتا ہے اور کارگہِ کائنات سے متعلق مشاہدات اور تجربات کی تلقین کرتا ہے لیکن "مذہب والی دنیا" میں وہ عقل و فکر کی صلاحیتوں کو سلب کر دیتا ہے۔ علم و بصیرت کے چراغ گُل کر دیتا ہے اور یہ کہتا ہے کہ جو کچھ تم سے کہا جائے اسے آنکھیں بند کر کے مان لو۔ اسی کا نام ایمان ہے ایمان اور فکر دو متضاد چیزیں ہیں جو یکجا نہیں ہو سکتیں۔

اصل یہ ہے کہ ان معترضین نے عیسائیت کو دیکھا اور اسی سے اس نتیجے پر پہنچ گئے کہ مذہب میں عقل کو کوئی دخل نہیں ہوتا۔ عیسائیت میں فی الواقعہ ایسا ہوتا ہے۔ لیکن ان معترضین کی غلط نگہی یہ ہے کہ انہوں نے عیسائیت کے مطالعہ سے اخذ کردہ نتائج کو بلا دیکھے بھالے اسلام پر چسپاں کر دیا اور ایسا کرنے سے پہلے قرآن مجید کے ورق پلٹنے کی بھی زحمت گوارہ نہ کی اور اگر کسی نے ایسا کیا بھی تو قرآن کو انگریزی تراجم کی رُو سے سمجھنے کی کوشش کی۔ جیسا کہ میں نے پہلے کہا ہے اوّل تو قرآن مجید کا کسی زبان میں بھی ترجمہ نہیں ہو سکتا اور پھر جو ترجمے انگریزی زبان میں ہوئے ہیں (خواہ وہ غیر مسلموں کے ہوں اور خواہ ان کے تتبع میں مسلمانوں کے) ان میں قرآنی اصطلاحات کا ترجمہ عیسائیت کی مروجہ اصطلاحات میں کیا گیا ہے۔ مثلاً اللہ کا ترجمہ (GOD) رَبّ کا ترجمہ (LORD) نبی کا ترجمہ (PROPHET) عبادت کا ترجمہ (WORSHIP) دین کا ترجمہ (RELIGION)۔ انگریزی زبان کی ان اصطلاحات کی رُو سے نہ صرف یہ کہ قرآن مجید کا مفہوم سمجھ میں نہیں آ سکتا، اس کا پیغام، اس کی تعلیم، اس کے نظریاتِ حیات، اس کے مقاصدِ زندگی مسخ ہو جاتے ہیں اور اسلام بھی باقی مذاہب کی طرح اوہام و ابہام کا مجموعہ بن کر رہ جاتا ہے۔ اسی ضمن میں ان مترجمین نے ایمان کا ترجمہ (FAITH) کر دیا اور چونکہ ان کے ہاں (FAITH) اور (REASON) دو متضاد چیزیں ہیں اس لئے انہوں نے اسلام کے خلاف بھی یہ اعتراض کر دیا کہ اس میں غور و فکر اور علم و بصیرت کی کوئی گنجائش نہیں، ایمان نام ہے پیش کردہ عقائد کو آنکھیں بند کر کے مان لینے کا، جو ایسا نہیں کرتا وہ کافر ہے۔ اس قسم کے اعتراضات قرآن کریم سے بے خبری کی دلیل ہے۔

جیسا کہ پہلے بتایا جا چکا ہے ایک علم ہے بالحواس جس کی بنیاد مطالعہ، مشاہدہ، تجربہ اور انسانی فکر پر ہے اس کے دروازے تمام انسانوں پر یکساں کھلے ہیں اور امتِ مسلمہ کو اس کی تحصیل کی خاص طور پر تاکید کی گئی ہے۔ لیکن علم کی ایک اور قسم بھی ہے جسے وحی کہہ کر پکارا جاتا ہے۔ یہ علم خدا کی طرف سے اس کے برگزیدہ انسانوں کو براہِ راست عطا کیا جاتا تھا، جنہیں انبیائے کرام کہا جاتا ہے۔ اس علم میں نبی کے ذاتی مطالعہ، مشاہدہ، تجربہ یا فکر کا کوئی دخل نہیں ہوتا تھا، یوں کہیئے کہ یہ اسے خارج سے (OBJECTIVELY) ملتا تھا۔ یہ وحی آخری مرتبہ حضور نبی اکرمؐ کو ملی اور اب اپنی مکمل اور غیر محرّف شکل میں قرآن مجید میں محفوظ ہے۔ یہ وحی حضراتِ انبیاء کرامؑ کو کس طرح ملتی تھی۔ اس طریق کی کنہ و ماہیت کیا تھی یہ بات کسی غیر نبی کے سمجھ میں نہیں

آسکتی۔

لیکن اگر یہ بات ہماری سمجھ میں نہیں آسکتی تو اس سے کچھ فرق نہیں پڑتا۔ اس لئے کہ ہمارا تعلق اس طریقہ یا ذریعہ سے نہیں جس کی رُو سے یہ علم حضراتِ انبیاء کرامؑ کو ملتا تھا۔ ہمارا تعلق اس علم سے ہے جو حضور نبی اکرمؐ کو بذریعہ وحی ملا اور جو اب قرآن کریم میں محفوظ ہے۔ یعنی ہمارا تعلق اس کتاب کے مندرجات (CONTENTS) سے ہے نہ کہ اس طریق سے جس کی رُو سے یہ نبی اکرمؐ کو ملی تھی۔ سوال یہ ہے کہ اس کتاب کے مندرجات کو آنکھیں بند کر کے مان لینے کا حکم دیا گیا ہے یا اس میں غور و فکر کی گنجائش ہے۔

غور و فکر کی گنجائش تو ایک طرف، خدا کا حکم یہ ہے کہ قرآن مجید کی ایک ایک آیت کو علم و بصیرت کی رُو سے پرکھو اور عقل و شعور اور تدبر و تفکر کی رو سے سمجھنے کی کوشش کرو۔ اس طرح اگر تمہارا قلب و دماغ اس کی صداقت پر مطمئن ہو جائے تو پھر اسے مانو، ورنہ مت مانو۔ جس دعویٰ کو قلب و دماغ کے کامل اطمینان کے بغیر مانا جائے اسے ایمان کہا ہی نہیں جائے گا۔ ایمان (CONVICTION) کا نام ہے۔ دیکھئے اس حقیقت کو قرآن کس قدر واضح الفاظ میں بیان کرتا ہے۔ سب سے پہلے وہ قرآن کی دعوت پیش کرنے والے، یعنی حضور نبی اکرمؐ سے کہتا ہے کہ

قُلْ هٰذِهٖ سَبِيْلِيْ اَدْعُوْٓا اِلَى اللّٰهِ عَلٰى بَصِيْرَةٍ اَنَا وَمَنِ اتَّبَعَنِيْ (۱۲/۱۰۸)

ان سے کہہ دو کہ میری راہ بالکل صاف اور سیدھی ہے اور وہ یہ کہ میں جو تمہیں خدا کی طرف دعوت دیتا ہوں تو علیٰ وجہ البصیرت ایسا کرتا ہوں۔ میں بھی ایسا کرتا ہوں، اور میرے متبعین بھی ایسا ہی کریں گے۔

یہ اس لئے کہ جس کتابِ عظیم کی طرف دعوت دی جاتی تھی وہ خود اپنے آپ کو کتابِ مبین (واضح اور روشن کتاب) برہان (یعنی بر دلائل) اور بصائر للناس (نوعِ انسان کے لئے وجہ بصیرت) کہہ کر پیش کرتی ہے۔ اس کے بعد دیکھئے کہ جو لوگ اس میں پیش کردہ صداقتوں پر ایمان لاتے ہیں ان کی کیفیت کیا ہوتی ہے۔ سورۃ الفرقان میں مومنین کی خصوصیات بیان کرتے ہوئے کہا کہ

وَالَّذِيْنَ اِذَا ذُكِّرُوْا بِاٰيٰتِ رَبِّهِمْ لَمْ يَخِرُّوْا عَلَيْهَا صُمًّا وَّعُمْيَانًا (۲۵/۷۳)

یہ وہ لوگ ہیں کہ، اور تو اور جب ان کے سامنے آیاتِ خداوندی بھی پیش کی جاتی ہیں تو وہ ایسا نہیں کرتے کہ عقل و فکر کو بالائے طاق رکھ کر اندھوں اور بہروں کی طرح ان پر گر پڑیں۔ وہ انہیں علم و بصیرت کی رو سے تسلیم کرتے ہیں۔

(ضمناً) جہاں تک میرا علم میری راہ نمائی کرتا ہے مذاہبِ عالم کی مبینہ آسمانی کتابوں میں کہیں بھی ان مذاہب کے متبعین کی یہ خصوصیت نہیں بتائی گئی۔ یہ امتیازی خصوصیت صرف قرآن پر ایمان لانے والوں کی بتائی گئی ہے۔ کیا اس کے بعد یہ پوچھنے کی ضرورت رہ جاتی ہے کہ اسلام میں عقل و فکر کی اہمیت کیا ہے؟

جب ایمان علم و بصیرت اور عقل و فکر کی رو سے لایا جاتا ہے تو جو لوگ عقل و فکر سے کام نہ لیں انہیں اور تو اور خود رسول اللہؐ کی تبلیغ بھی کچھ فائدہ نہیں دے سکتی تھی۔ سورج کی روشنی تو اسے ہی فائدہ دے گی

جو اپنی آنکھیں کھلی رکھے گا۔ اسی لئے فرمایا :-

وَمِنْهُمْ مَّنْ يَسْتَمِعُونَ إِلَيْكَ أَفَأَنْتَ تُسْمِعُ الصُّمَّ وَلَوْ كَانُوا لَا يَعْقِلُونَ (۱۰/۴۲)

ان میں ایسے لوگ بھی ہیں جو بظاہر ایسا نظر آتا ہے کہ تمہاری بات سن رہے ہیں لیکن وہ درحقیقت تمہاری بات سن نہیں رہے ہوتے۔ اس لئے کہ وہ عقل و فکر سے کام نہیں لیتے۔ سوچو کہ تم ایسے بہروں کو کس طرح سُنا سکو گے۔

اس سے آگے ہے :-

وَمِنْهُمْ مَّنْ يَنْظُرُ إِلَيْكَ أَفَأَنْتَ تَهْدِي الْعُمْيَ وَلَوْ كَانُوا لَا يُبْصِرُونَ (۱۰/۴۳)

اور ان میں ایسے لوگ بھی ہیں کہ وہ بظاہر تمہاری طرف آنکھیں کھولے دیکھ رہے ہوتے ہیں لیکن وہ حقیقت دیکھ نہیں رہے ہوتے وہ محض بصارت سے کام لیتے ہیں، بصیرت سے نہیں۔

یہ کچھ کہنے کے بعد قرآنِ کریم ایک عظیم حقیقت کی طرف راہنمائی کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ جب یہ لوگ صحیح راہنمائی سے محروم رہ جانے کی وجہ سے غلط راستے اختیار کریں گے اور اس طرح تباہی اور بربادی کے جہنم میں جا گریں گے تو سطحیں لوگ کہیں گے کہ اللہ نے بڑا ظلم کیا لیکن حقیقت یہ ہے کہ

إِنَّ اللَّهَ لَا يَظْلِمُ النَّاسَ شَيْئًا وَلَٰكِنَّ النَّاسَ أَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُونَ (۱۰/۴۴)

اللہ کسی پر ظلم و زیادتی نہیں کرتا، لوگ اپنے آپ پر ظلم کرتے ہیں۔

سعدیؒ کے الفاظ میں ؎

گر نہ بیند بروز شپرہ چشم — چشمۂ آفتاب را چہ گناہ

قرآنِ کریم سے راہنمائی حاصل کرنے کے لئے غور و تدبر شرط ہے :-

أَفَلَا يَتَدَبَّرُونَ الْقُرْآنَ أَمْ عَلَىٰ قُلُوبٍ أَقْفَالُهَا (۴۷/۲۴)

یہ لوگ قرآن میں تدبر نہیں کرتے ایسا نظر آتا ہے کہ ان کے دلوں نے اپنے اوپر خود وضع کردہ تالے ڈال رکھے ہیں تاکہ ان کے اندر کچھ داخل ہی نہ ہو سکے۔

" أَقْفَالُهَا " میں ھا کی ضمیر پر غور کیجئے اور پھر دیکھئے کہ قرآن کا اعجاز کس طرح اُبھر کر سامنے آجاتا ہے اس نے کہا ہے کہ ان کے دلوں پر کسی اور نے تالے نہیں ڈال رکھے ان کے دلوں نے خود اپنے تالے اپنے اوپر ڈال رکھے ہیں اس کی صحیح تحسین کوئی علم النفس کا ماہر (PSYCHOLOGIST) ہی کر سکے گا!

جو لوگ اس دعوت کی مخالفت کرتے ہیں وہ ان سے کہتا ہے کہ اس میں جھگڑنے اور دھاندلی مچانے کی کوئی بات نہیں۔ میں اپنی دعوت دلیل و برہان کی رُو سے پیش کرتا ہوں۔

هَاتُوا بُرْهَانَكُمْ إِنْ كُنْتُمْ صَادِقِينَ (۲/۱۱۱)

اگر تم اپنے دعوے میں سچے ہو تو اس کے ثبوت میں دلائل پیش کرو جس کے دلائل محکم ہوں گے سمجھ لیا جائے گا کہ وہ حق پر ہے۔

ان تصریحات سے واضح ہے کہ قرآن کریم کی رُو سے علم و بصیرت اور عقل و فکر کو کس قدر اہمیت حاصل

ہے۔ اس باب میں ابھی بہت کچھ اور بھی کہا جا سکتا ہے لیکن میں مقطع کے طور پر ایک ایسی درخشندہ مثال پیش کرنا چاہتا ہوں جس کی تابانیاں عالمگیر اور زمان و مکان کی حدود سے ماورا ہیں۔ حضور نبی اکرمؐ نے عمر بھر قرآن کریم کی انسانیت ساز تعلیم پیش کی اور مخالفین نے اس کی اندھا دھند مخالفت کی۔ آخر الامر حضورؐ نے ایک دن ان سے کہا کہ میں عمر بھر تم سے بڑی تفصیلی گفتگو میں کرتا رہا ہوں لیکن آج میں تم سے صرف ایک بات کہنا چاہتا ہوں ـــــ صرف ایک بات ـــــ

قُلْ اِنَّمَآ اَعِظُكُمْ بِوَاحِدَةٍ (۳۴/۴۶)

انہوں نے جی میں کہا کہ یہ صرف ایک بات کہنا چاہتا ہے اس کے سننے میں کیا حرج ہے۔
انہیں اس طرح آمادہ پا کر آپؐ نے فرمایا کہ وہ بات ایسی معمولی نہیں کہ تم اسے یونہی چلتے چلتے سن لو۔ وہ بڑی اہم بات ہے اس لئے خدا کھڑے ہو کر دل کے کانوں سے سنو ـــــ سب نہیں تو ایک ایک دو دو کر کے ہی کھڑے ہو جاؤ

اَنْ تَقُوْمُوْا لِلّٰهِ مَثْنٰى وَفُرَادٰى

جب آپؐ نے انہیں اس طرح نفسیاتی طور پر اپنی طرف متوجہ کر لیا تو فرمایا جو بات تم سے کہنا چاہتا ہوں یہ ہے کہ

ثُمَّ تَتَفَكَّرُوْا (۳۴/۴۶)

تم سوچا کرو ـــ غور و فکر کی عادت ڈالو۔

اگر تم نے اس پر عمل کر لیا تو میرا مقصد بھی حل ہو جائے گا اور تم بھی تباہی سے بچ جاؤ گے۔ آپ غور کیجئے کہ کیا یہ "مقطع کا بند" اس باب میں حرفِ آخر نہیں؟

فکر کی توسیع

اسلام میں فکر کی اہمیت کے بعد ہم فکر کی توسیع کی طرف آتے ہیں۔ توسیع سے مراد اگر یہ ہے کہ فکر کا دائرہ کس قدر وسیع ہے اور زندگی کے کون کون سے گوشے اس کے اندر آتے ہیں تو اس کا جواب یہ ہے کہ علم کی طرح فکر کی وسعت بھی حدود فراموش ہے۔ قرآن کریم کی رو سے انسانی زندگی ایک جوئے رواں کی طرح اس دنیا سے اگلی دنیا تک مسلسل جاتی ہے اور وہ ان دونوں دنیاؤں کو فکر کی جولانگاہ قرار دیتا ہے وہ کہتا ہے:-

كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمُ الْاٰيٰتِ لَعَلَّكُمْ تَتَفَكَّرُوْنَ فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ (۲/۲۱۹)

اس طرح اللہ تعالیٰ حقائق کو واضح طور پر بیان کرتا ہے تاکہ تم دنیا اور آخرت کی زندگی پر غور و فکر کر سکو۔
اس میں شبہ نہیں کہ اُخروی زندگی کی حقیقت و ماہیت کو ہم اپنے شعور کی موجودہ سطح پر سمجھ نہیں سکتے لیکن اُس دنیا کے متعلق قرآن کریم نے جو کچھ تمثیلی انداز میں بیان کیا ہے اس پر غور و فکر سے ہم اس کے مقصد اور غایت کو سمجھ سکتے ہیں۔ اس لحاظ سے فکر کا دائرہ دنیا اور آخرت دونوں کو محیط ہے۔ لیکن سردست ہم اپنے آپ کو اسی دنیا تک محدود رکھتے ہیں۔

اگر فکر کی توسیع سے مراد یہ ہے کہ کیا یہ کسی خاص زمانے تک محدود تھا، یا اسے اس سے آگے بڑھا کر موجودہ

دور تک بھی لایا جا سکتا ہے، تو اس ضمن میں سمجھ لینا چاہیئے کہ یہ کسی خاص زمانے کے ساتھ مختص نہیں تھا، نہ ہی مختص ہو سکتا ہے۔ قرآن مجید تمام نوعِ انسانی کے لئے ابدی طور پر ضابطۂ ہدایت ہے۔ اس لئے اس کی تعلیم بھی ابدی ہے۔ اس نے جو تدبر و تفکر کا حکم دیا ہے تو یہ بھی دائمی ہے اس لئے تدبر و تفکر کا سلسلہ بھی ختم نہیں ہو سکتا۔

اس فکر و تدبر کے دو گوشے ہیں ایک خارجی کائنات اور دوسرا انسانی معاملات کی دُنیا۔ قرآن مجید نے کہا ہے کہ فطرت کے رموز و اسرار تخلیقِ کائنات کے ساتھ ہی وجود میں آ گئے تھے لیکن یہ انسانی نگاہوں سے پنہاں تھے اور اس انتظار میں کہ انسانی علم و فکر ترقی کرتا ہوا آگے بڑھے اور ان حقائق پر پڑے ہوئے پردوں کو بے نقاب کرتا چلا جائے۔ واضح رہے کہ علومِ سائنس کے محقق ان حقائق کو ایجاد (INVENT) نہیں کرتے، انہیں صرف بے نقاب (DISCOVER) کرتے ہیں۔ قرآن مجید میں ہے :-

سَنُرِيهِمْ آيَاتِنَا فِي الْآفَاقِ وَفِي أَنْفُسِهِمْ حَتَّىٰ يَتَبَيَّنَ لَهُمْ أَنَّهُ الْحَقُّ (۴۱/۵۳)

ہم انہیں عالم النفس و آفاق (خارجی کائنات اور انسانی دنیا) میں اپنی نشانیاں (آیات) دکھاتے جائیں گے تا آنکہ یہ حقیقت بے نقاب ہو کر سامنے آ جائے کہ قرآن کا ہر دعویٰ صداقت پر مبنی ہے۔

یعنی عالم النفس و آفاق کی جو حقیقت بے نقاب ہو گی وہ قرآنی حکیم کے کسی نہ کسی دعوے کی صداقت کی شہادت بن کر سامنے آئے گی۔

(ضمناً) دُنیا میں مذہب اور سائنس میں تصادم چلا آ رہا ہے۔ سائنس کو مذہب کی دشمن اور مذہب کو سائنس کی ضد کہا جاتا ہے۔ ان کے برعکس قرآن یہ کہتا ہے کہ سائنس کا ہر مبنی بر حقیقت انکشاف اس کے کسی نہ کسی دعوے کی صداقت کی شہادت ہو گا۔

بہر حال ہم کہہ یہ رہے تھے کہ قرآن مجید کی رُو سے انسانی فکر کا فریضہ ہے کہ وہ رموزِ کائنات کو بے نقاب کرتا چلا جائے اور اس طرح فطرت کی قوتوں کو مسخر کرے۔ اس کا ارشاد ہے :-

وَسَخَّرَ لَكُمْ مَا فِي السَّمَاوَاتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا مِنْهُ ۚ إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَآيَاتٍ لِقَوْمٍ يَتَفَكَّرُونَ (۴۵/۱۳)

کائنات کی پستیوں اور بلندیوں (ارض و سموٰت) میں جو کچھ ہے خدا نے ان سب کو تمہارے لئے مسخر کر رکھا ہے۔ اس میں ان لوگوں کے لئے جو غور و فکر سے کام لیں حقیقت تک پہنچنے کی بہت بڑی نشانیاں ہیں۔

بالفاظِ دیگر توسیعِ فکر اور تسخیرِ کائنات لازم و ملزوم ہیں۔ کائنات کی وسعتیں ہنوز انسان کے حیطۂ تصور میں بھی نہیں آ سکتیں۔ انسان غاروں سے نکل کر چاند اور مریخ تک پہنچ گیا ہے لیکن اربابِ فکر و نظر کا کہنا ہے کہ اس نے ابھی اس بحرِ بے پایاں کے کنارے کو بھی نہیں چھوا، چہ جائیکہ اس نے اسے کلیتہً مسخر کر لیا ہو۔ اس سے آپ انسانی فکر کی وسعت کا اندازہ لگا سکتے ہیں۔

تسخیرِ کائنات کا ذکر آ گیا تو دیکھئے کہ قرآنِ کریم ہمیں کہاں تک لے جاتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ زندگی (LIFE) کرۂ ارض تک ہی محدود نہیں۔ فضائی کرّوں میں بھی ایسے ہیں جن میں زندگی موجود ہے۔ سورۃ الشوریٰ میں ہے :-

وَمِنْ آيَاتِهِ خَلْقُ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ
تخلیقِ ارض وسمٰوٰت میں تمہارے لئے بڑی بڑی نشانیاں ہیں۔
وَمَا بَثَّ فِيهِمَا مِنْ دَابَّةٍ
اور اس جاندار مخلوق میں بھی جو زمین اور فضائی کرّوں میں بکھری پڑی ہے۔

اس سے اس نے بتایا کہ زندگی دوسرے کرّوں میں بھی موجود ہے۔ اس میں اور اس آیت کے اگلے ٹکڑے میں اس نے جو کچھ کہا ہے وہ اس حقیقت کی بیّن شہادت ہے کہ قرآنِ حکیم انسانی فکر کی تخلیق نہیں۔ اس کا سرچشمہ ماورائے فکرِ انسانی ہے۔ اس نے کہا ہے :-

وَهُوَ عَلٰى جَمْعِهِمْ إِذَا يَشَاءُ قَدِيرٌ (۴۲/۲۹)۔
وہ اس پر بھی قادر ہے کہ کسی دن اپنے قانونِ مشیت کی رو سے کرۂ ارض اور فضائی کرّوں میں ملاپ پیدا کر دے۔ ان میں رابطہ باہمی پیدا ہو جائے۔

غور کیجئے کہ آج سے چودہ سو سال پہلے ساری دنیا کے دانشوروں کی فکر مل کر بھی یہ کچھ کہہ سکتی تھی؟ یہ ہیں الفنس و آفاق کے وہ رموز جو قرآن کی دفتین میں پوشیدہ ہیں اور جو فکرِ انسانی کی توسیع کے ساتھ بے نقاب ہوتے چلے جا رہے ہیں۔ علامہ اقبالؒ کے الفاظ میں ؎

صد جہانِ تازہ در آیاتِ اوست — عصرہا پیچیدہ در آناتِ اوست
یک جہانش عصرِ حاضر را بس است — گیر اگر در سینۂ دل معنی رس است
بندۂ مومن ز آیاتِ خدا است — ہر جہاں اندر بر او چوں قبا است
چوں کہن گردد جہانے در برش — می دہد قرآں جہانے دیگرش (جاوید نامہ)

لیکن فکر کی یہ توسیع تو اقوامِ مغرب کے حصے میں آئی ہے۔ ہم (مسلمان) کہ جنہیں اس کتابِ عظیم کا وارث قرار دیا گیا تھا، اس میدان میں ان اقوام سے صدیوں پیچھے ہیں۔ ہم جب بھی علومِ سائنس کا ذکر کرتے ہیں تو ابنِ مسکویہ، رازی، بوعلی سینا وغیرہ سے آگے نہیں بڑھتے جو صدیوں پہلے ہو گزرے ہیں۔ ہماری فکر کی حدِ آخر ان ہی محققین کا زمانہ ہے۔ اس کے بعد ہم پر جمود طاری ہو چکا ہے۔ لہٰذا، ہمارے ہاں توسیعِ فکر کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ ہم نے جب بھی اس جمود کو توڑنا چاہا تو سوال فکر کا احیاءِ نو (RENAISSANCE) کا ہو گا۔ ابھی تو کیفیت یہ ہے کہ

منزلِ مقصودِ قرآں دیگر است — رسم و آئینِ مسلماں دیگر است

لیکن مغربی اقوام کی فکر بھی عالمِ آفاق (خارجی کائنات) میں محصور ہو کر رہ گئی ہے۔ عالمِ النفس (انسانی دنیا) کی طرف ان کی نگاہ ہی نہیں اٹھتی۔

برٹرنڈ رسل کے الفاظ میں :-

ہماری مشکل یہ ہے کہ ہم نے خارجی قوتوں کو بے حساب انداز سے مسخر کر لیا ہے لیکن ان انسانی قوتوں کو قطعاً مسخر نہیں کیا جو خود ہمارے اندر ہیں۔ (AUTHORITY AND THE INDIVIDUAL)

تنہا سائنس کے انکشافات اور فطرت کی قوتوں کی تسخیر، انسانی مسائل کو حل نہیں کرسکتی۔ مغرب ہی کے ایک اور مفکر ڈاکٹر میسن (J.W.T. MASON) نے اپنی کتاب (CREATIVE FREEDOM) میں کہا ہے :-

ہم نے زندگی کی ابتدا سائنس کی کاریگری سے اس توقع کے ساتھ کی کہ مادی کامرانیاں زندگی کے مقصدوں کو حل کر دیں گی لیکن ہم دیکھ رہے ہیں کہ ہم غلطی پہ تھے۔ زندگی کے مسائل اتنے آسان نہیں۔

اتنا ہی نہیں کہ اس سے انسانی مسائل کا حل دریافت نہیں ہوسکا اس سے انسان تباہی اور بربادی کے جہنم کی طرف کشاں کشاں چلا جا رہا ہے اور یورپ کے دانشور اس کی اس تباہی پہ ماتم کر رہے ہیں لیکن بے بس ہیں اور اپنی بے بسی کا اعتراف اور اظہار برملا کرتے ہیں (مثلاً) ڈاکٹر ولیم برینٹ لکھتا ہے :-

انسان ابھی اس مقام سے بہت دور ہے کہ وہ سیکھ لے کہ وہ اپنے آپ پر کس طرح حکومت کر سکتا ہے۔ انسان ہر جگہ پریشان اور بے یقینی کے عالم میں بھر رہا ہے۔ قدیم اقدار و عقائد ختم ہو چکے ہیں اور ان کی جگہ کسی اور نے نہیں لی دُنیا کے بیشتر حصے پر تعمیری قوتوں کے بجائے تخریبی قوتیں چھا چکی ہیں اور انسان نے جو کچھ صدیوں سے حاصل کیا تھا وہ سب ختم ہو رہا ہے۔ انسان نے اپنے طبیعی ماحول پہ اچھا خاصا قابو پالیا ہے لیکن اس نے اپنے جذباتی ماحول پہ قابو پانا نہیں سیکھا۔

(FOUNDATIONS OF HUMAN CONFLICT)

قرآن کریم نے عالم آفاق کے ساتھ عالم النفس پر غور و فکر کی تاکید اس لئے کی تھی کہ "انسان اپنے پر حکومت کرنا بھی سیکھ لے"

اَوَ لَمْ يَتَفَكَّرُوْا فِيْٓ اَنْفُسِكُمْ (۳۰/۸)

"کیا تم نے کبھی اپنے آپ پر بھی غور کیا ہے ؟"

کا مقصد یہی تھا۔ اس حصے کو نظر انداز کر دینے کا نتیجہ ہے کہ انسان بُری طرح پریشان و تباہ حال بھر رہا ہے علامہ اقبالؒ کے الفاظ میں :-

عشق ناپید و خرد می گزدش صورت مار | عقل کو تابع فرمان نظر کر نہ سکا
ڈھونڈنے والا ستاروں کی گذرگاہوں کا | اپنے افکار کی دنیا میں سفر کر نہ سکا
جس نے سورج کی شعاعوں کو گرفتار کیا | زندگی کی شب تاریک سحر کر نہ سکا

قرآن کریم نے اسی قسم کی اقوام سابقہ کے متعلق کہا تھا کہ جب انہوں نے اقدار و قوانین خداوندی سے بے اعتنائی برتی تو وہ تباہ و برباد ہوگئیں اور خارجی کائنات کے متعلق ان کا علم ان کے کسی کام نہ آیا۔

فَمَآ اَغْنٰى عَنْهُمْ سَمْعُهُمْ وَلَآ اَبْصَارُهُمْ وَلَآ اَفْـِٕدَتُهُمْ مِّنْ شَيْءٍ اِذْ كَانُوْا يَجْحَدُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ (۴۶/۲۶)۔

جب انہوں نے قوانین خداوندی سے سرکشی برتی تو ان کا علم و فکر انہیں تباہی سے بچا نہ سکا۔

فطرت کی قوتوں کو مسخر کرکے انہیں اقدارِ خداوندی کے مطابق عالمگیر انسانیت کی منفعت کے لئے عام کرنے کا فریضہ اُس اُمت نے ادا کرنا تھا جسے کتاب اللہ کی وارث قرار دیا گیا تھا لیکن جو اُمت عالم آفاق کو مسخر نہ کرسکی وہ عالم النفس کے مسائل کا حل کیا پیش کرتی ؟ وہ تو خود اپنی مشکلات کے حل کے لئے دوسروں کی محتاج ہے اور یہ سب اس لئے کہ اس نے اپنی فکر و تدبر کے چراغ گل کر رکھے ہیں۔ اس سے ہم زندگی کی کون کون سی

تاریک راہوں میں بھٹکتے پھر رہے ہیں، اس کی تفصیل طول طویل ہے۔ ہم سردست اس کے صرف اس گوشے کو لیتے ہیں جس میں ہماری پریشانیٔ فکر و نظر ابھر کر سامنے آ رہی ہے اور وہ ہے پاکستان میں آئین و قوانین سازی کا مسئلہ۔

آئین و قوانین سازی کا مسئلہ

ہم نے اس خطۂ زمین کو اس لئے حاصل کیا تھا کہ یہاں قرآنی اقدار و قوانین کو نافذ کر کے اس مملکت کو اسلامی بنایا جا سکے۔ قرآن مجید نے اسلامی اور غیر اسلامی مملکت میں نہایت روشن خطِ امتیاز کھینچ دیا ہے جہاں کہا ہے:

وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ (۵/۴۴)

جو لوگ خدا کی کتاب کے مطابق حکومت قائم نہیں کرتے انہیں کافر کہا جاتا ہے۔

یعنی اسلامی مملکت وہ ہے جس میں جملہ امور قرآنِ مجید کے مطابق سرانجام پائیں۔ قرآنِ مجید کی کیفیت یہ ہے کہ اس نے (بجز چند احکام) امورِ مملکت کے متعلق اصول و اقدار دیئے ہیں جنہیں حدود اللہ کہہ کر پکارا جاتا ہے بالفاظِ دیگر اللہ تعالیٰ نے (BOUNDARY LINES) متعین کر دی ہیں جن کے اندر رہتے ہوئے ہر زمانے کی اسلامی مملکت، امورِ حکومت سرانجام دے گی۔ یہ حدود و اقدار تو ہمیشہ کے لئے غیر متبدل رہیں گے اور ان کے اندر رہتے ہوئے جو آئین و قوانین مرتب کئے جائیں گے وہ زمانے کے تقاضوں کے مطابق بدلتے رہیں گے۔ بالفاظ دیگر انسانی فکر صرف ان حدود کی پابند ہو گی۔ ان کے اندر رہتے ہوئے اسے اپنی کارفرمائی کے لئے پوری پوری آزادی ہو گی۔ جُوں جُوں زمانے کے تقاضے بدلتے اور آگے بڑھتے جائیں گے۔ اس فکر میں توسیع ہوتی جائے گی۔ علامہ اقبالؒ نے اسلامی مملکت کی اس خصوصیت اور انفرادیت کو اپنے خطبات میں بڑے بصیرت افروز اور دل نشیں انداز سے بیان کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ

> اسلام کا پیش کردہ تصور یہ ہے کہ حیاتِ کلّی کی روحانی اساس ازلی اور ابدی ہے لیکن اس کی نمود تغیّر و تنوع کے پیکروں میں ہوتی ہے۔ جو معاشرہ حقیقتِ مطلقہ کے متعلق اس قسم کے تصور پر متشکل ہو اس کے لئے ضروری ہو گا کہ وہ اپنی زندگی میں مستقل اور تغیر پذیر (عناصر) میں تطابق اور توافق پیدا کرے۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ اس کے پاس اجتماعی زندگی کے نظم و ضبط کے لئے مستقل اور ابدی اصول ہوں۔ اس لئے کہ اس دنیا میں جہاں تغیّر کا دور دورہ ہے ابدی اصول ہی وہ محکم سہارا بن سکتے ہیں جن پر انسان اپنا پاؤں ٹکا سکے۔ لیکن اگر ابدی اصولوں کے متعلق یہ سمجھ لیا جائے کہ ان کے دائرہ میں تغیر کا امکان ہی نہیں ـــــ وہ تغیر جسے قرآن نے عظیم آیات اللہ میں شمار کیا ہے۔ تو اس سے زندگی جو اپنی فطرت میں متحرک واقع ہوئی ہے یکسر جامد بن کر رہ جائے گی ـــــ یورپ کو عمرانی اور سیاسی زندگی میں جو ناکامی ہوئی ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کے ہاں کوئی ابدی اور غیر متبدل اصولِ حیات نہیں تھے۔ اس کے برعکس گزشتہ پانچ سو سال میں اسلام جس قدر جامد اور غیر متحرک بن کر رہ گیا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ مسلمانوں نے مستقل اقدار کے دائرے میں اصولِ تغیر کو نظر انداز کر رکھا ہے لہٰذا، دیکھنے کی چیز یہ ہے کہ اسلام کی ہیئت اور ترکیب میں کون سا اصولِ حرکت کارفرما ہے یہ وہی اصول ہے جسے اجتہاد کہتے ہیں۔

(چھٹا خطبہ)

اجتہاد نام ہی حدود اللہ کے اندر رہتے ہوئے پیش آمدہ مسائل کے فکری طور پر حل دریافت کرنے کا ہے جیسا کہ میں نے پہلے لکھا ہے (اور جسے علامہ اقبالؒ نے اپنے مندرجہ بالا اقتباس میں تحریر فرمایا ہے)۔ ہم اس غلط فہمی میں مبتلا ہیں کہ ہمارا فکری عمل ایک خاص زمانے تک محدود تھا۔ اس کے بعد اسلام میں فکر کی گنجائش نہیں رہی۔ لہٰذا، جو قوانین اور مسالک اُس زمانے میں وضع ہو چکے تھے وہ ابدی اور غیر متغیر ہیں، ان میں نہ حک و اضافہ ہو سکتا ہے نہ تغیر و تبدل۔ بالفاظِ دیگر، اس کے معنے یہ ہیں کہ اللہ تعالےٰ نے تفکر و تدبر کا جو حکم دیا تھا وہ ایک خاص زمانے تک کے لئے تھا۔ اس کے بعد وہ حکم منسوخ ہو چکا ہے، لہٰذا، اب اسلام سے متعلق کسی معاملے میں بھی غور و فکر سے کام نہیں لیا جا سکتا۔

علامہ اقبالؒ اس باب میں لکھتے ہیں :-

آیئے اب ایک نظر ان اصولوں پر ڈالیں جو قرآن نے قانون سازی کے سلسلے میں دیئے ہیں۔ ان پر غور کرنے سے یہ حقیقت واضح ہو جائے گی کہ ان اصولوں کی رُو سے یہ قطعاً نہیں ہوتا کہ انسانی فکر سلب ہو جائے اور قانون سازی کے لئے کوئی میدان ہی نہ رہے۔ اس کے برعکس ان اصولوں میں جس قدر وسعت رکھی گئی ہے اس سے انسانی فکر بیدار ہوتی ہے۔ . . . قرآن کی یہ تعلیم کہ حیات ایک ترقی پذیر عملِ ارتقاء ہے اس کی مقتضی ہے کہ ہر نئی نسل کو اس کا حق ہونا چاہیئے کہ وہ اپنی مشکلات کا حل خود تلاش کرے۔ وہ ایسا کرنے میں سلف کے علمی سرمایہ سے راہنمائی حاصل کر سکتے ہیں لیکن اسلاف کے فیصلے ان کے راستے میں رُکاوٹ نہیں بن سکتے۔ (چھٹا خطبہ)

آپ اسے فکر کی توسیع کہہ لیجئے یا اس کا احیاءِ نو، اس کے بغیر زندگی کا کوئی مسئلہ حل نہیں ہو سکتا ؎

جہانِ تازہ کی افکارِ تازہ سے ہے نمود کہ سنگ و خشت سے ہوتے نہیں جہاں پیدا

مقامِ تشکر ہے کہ صدرِ مملکتِ پاکستان جنرل محمد ضیاء الحق نے بھی اسلام کے اس بنیادی اصول کو سمجھ لیا ہے۔ اگلے دنوں ان کا ایک تفصیلی انٹرویو جو انہوں نے (INDIA TODAY) کے لئے دیا تھا، اخبارات میں شائع ہوا ہے۔ اس میں انہوں نے جب یہ کہا کہ میں اس جمہوریت کا سو فیصد قائل ہوں جسے اسلام نے متعین کیا ہے تو ان سے پوچھا گیا کہ کیا اس کا یہ مطلب ہے کہ وہ جب ڈیماکریسی کو دوبارہ قائم کریں گے تو وہ خالصتاً اس انداز کی ڈیماکریسی ہوگی، جسے قرآنِ کریم نے متعین کیا ہے!

تو اس کے جواب میں انہوں نے کہا :-

قرآن مجید میں اس طور پر کچھ متعین نہیں کیا گیا، اس میں صرف اصول دیئے گئے ہیں (ان اصولوں کو روبہ عمل لانے کے لئے) کوئی خاص شکل متعین نہیں کی گئی۔ اس کی شکل اور ہیئت ہمیں خود وضع کرنی ہوگی۔

(بحوالہ پاکستان ٹائمز، یکم مارچ ۱۹۸۸ء)

اگر پاکستان میں آئین و قوانین سازی کے سلسلے میں اس اصول پر عمل درآمد شروع ہو جائے — یعنی ہمارے اس طائرِ فکر کو جو صدیوں سے محبوسِ قفس ہے، اذنِ بال کشائی مل جائے — تو ہماری تمام مشکلات حل ہو جائیں اور یہ مملکت صحیح معنوں میں اسلامی بن جائے۔ قرآنی حدود کے اندر رہتے ہوئے فکری پرواز، یہ ہے اسلامی معاشرہ کے نشان راہ۔ اس سے آپ اندازہ لگا لیجئے کہ اسلام میں فکر کی توسیع کی جولانگاہ کہاں تک ہے؟

روزوں کا مقصد

(پرویز صاحب کا درسِ قرآنِ مجید)

(پرویز صاحب کا یہ درس، دو سال پہلے بھی شائع ہوا تھا لیکن احباب کا اصرار ہے کہ اسے ہر سال، رمضان المبارک سے قریب، شائع کیا جائے تاکہ روزہ داروں کو معلوم ہو کہ ان کے روزوں کی غرض و غایت کیا ہے۔ اس مقصد کے پیشِ نظر اسے درج ذیل کیا جاتا ہے۔)

(۰)

درسِ قرآنِ مجید

عزیزانِ گرامی قدر! درسِ قرآن کے سلسلہ کے اعتبار سے آج سورۃ النمل کی اگلی آیت سے سلسلۂ کلام شروع ہونا چاہیئے تھا لیکن احباب کے تقاضا کے پیشِ نظر آج کا درس روزہ کے موضوع کے لئے مختص کیا جا رہا ہے۔ میں اس درس میں روزوں کے مسائل کے متعلق بات نہیں کروں گا۔ یہ احکام سورۃ البقرہ کی تین چار آیات (۲/۱۸۳ - ۱۸۷) میں نہایت جامعیت سے بیان ہوئے ہیں، اس لئے ان کے دہرانے کی ضرورت نہیں۔ ان کے بجائے میں اس امر کی وضاحت کرنا چاہتا ہوں کہ قرآنِ کریم کی رو سے روزوں کا مقصد کیا ہے؟ ان کی غایت کیا ہے؟ یہ کیوں فرض قرار دیئے گئے ہیں؟

قرآن کریم کی ایک خصوصیت (بلکہ جہاں تک میری نگاہ کام کرتی ہے اس کی انفرادیت) یہ بھی ہے کہ یہ جب کوئی حکم دیتا ہے تو اس کے ساتھ اس کی وضاحت بھی کر دیتا ہے کہ یہ حکم کیوں دیا گیا ہے؟ اس کی غرض و غایت کیا ہے؟ اس پر عمل پیرا ہونے کا نتیجہ کیا ہوگا؟ مثلاً اس قسم کی آیات آپ کو کئی ایک مقامات پر ملیں گی۔

اَنْزَلَ اللّٰهُ عَلَيْكَ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ۔ (۴/۱۱۳)

"اے رسولؐ! اللہ نے تم پر کتاب اور حکمت نازل کی ہے۔"

کتاب کے معنی احکام یا قوانین کے ہیں اور حکمت سے مراد، ان احکام و قوانین کی غرض و غایت۔ یہ دونوں منزّل من اللہ

ہیں۔ احکام کے سلسلے میں یہ انداز عظیم حکمتِ بالغہ پر مبنی ہے۔ اگر کسی کو کوئی حکم دیا جائے لیکن اس کی غرض و غایت نہ بتائی جائے۔ یعنی اسے یہ نہ بتایا جائے کہ اسے وہ حکم کیوں دیا جا رہا ہے۔ تو وہ اس کی تعمیل طوعاً و کرہاً کر لیگا، بطیبِ خاطر نہیں کرے گا۔ مستبد حکومتیں اسی طرح احکام صادر اور نافذ کرتی ہیں۔ لوگ ان پر بامرِ مجبوری عمل پیرا ہوتے ہیں اور اسی لئے ان سے گریز کی راہیں تراشتے اور فرار کے طریقے سوچتے رہتے ہیں۔ اگر انہیں بتا دیا جائے کہ ان احکام کی اطاعت سے انہیں کیا حاصل ہوگا۔ اس میں خود ان کے کیا کیا فوائد مضمر ہیں۔ تو وہ ان پر دل و دماغ کی کامل رضامندی سے عمل پیرا ہوں گے اور ان سے منحرف ہونے کا خیال تک بھی دل میں نہ لائیں گے۔ کتاب کے ساتھ حکمت کی وضاحت کی یہی مصلحت ہے۔

دوسرے یہ کہ جب آپ کو بتا دیا جائے کہ اس حکم کی تعمیل کا نتیجہ یہ ہوگا تو آپ قدم قدم پر اس کا جائزہ لیتے جائیں گے کہ اس حکم کی صحیح معنوں میں تعمیل ہو رہی ہے یا نہیں۔ اگر اس حکم کی غایت نہ بتائی جائے تو آپ اس پر بال سوچے سمجھے مکینکی طور پر عمل کرتے رہیں گے اور کبھی یہ نہیں دیکھ سکیں گے کہ اس حکم کی تعمیل صحیح طور پر ہو رہی ہے یا نہیں۔ اور اگر آپ نے اپنے ذہن میں فرض کر لیا کہ اس کا نتیجہ یہ برآمد ہوگا تو آپ بڑی غلط فہمی میں مبتلا رہیں گے اور ہو سکتا ہے کہ آپ کی ساری محنت رائیگاں چلی جائے۔ مثال کے طور پر یوں سمجھئے کہ ڈاکٹر مریض کے لئے ایک دوائی تجویز کرتا ہے اور کہتا ہے کہ دوائی دینے کے بعد مریض کا ٹمپریچر لیتے جائیں۔ ہر گھنٹے کے بعد کم از کم ایک ڈگری بخار کم ہو جائے گا۔ آپ مریض کو دوا پلاتے ہیں اور ڈاکٹر کی ہدایت کے مطابق اس کا ٹمپریچر لیتے ہیں۔ اگر بخار کم ہو رہا ہے تو آپ کو اطمینان ہوگا اور آپ علاج جاری رکھیں گے۔ لیکن اگر آپ دیکھیں کہ بخار کم نہیں ہو رہا تو آپ کو از سرِ نو جائزہ لینا ہوگا کہ یا تو مرض کی تشخیص صحیح نہیں ہوئی یا دوائی ٹھیک نہیں ملی۔ اور یا اس کے استعمال میں آپ سے کوئی غلطی ہوئی ہے۔ یہ نہیں ہوگا کہ ڈاکٹر کے کہنے کے مطابق نتیجہ برآمد نہ ہو اور آپ بدستور وہی دوائی دیتے چلے جائیں۔ اگر آپ ایسا کرتے ہیں تو اس کا نتیجہ نکل سکتا ہے ظاہر ہے۔ اللہ تعالیٰ نے جہاں کوئی حکم دیا ہے اس کے ساتھ ہی یہ بھی بتا دیا ہے کہ اس پر عمل پیرا ہونے سے نتیجہ کیا نکلے گا۔ اگر اس کا وہ نتیجہ برآمد نہیں ہوتا تو آپ کو رُک کر سوچنا ہوگا کہ اس حکم کی تعمیل میں آپ سے کیا غلطی ہو گئی ہے۔ اس سے نہ صرف یہ کہ آپ کی محنت رائیگاں نہیں جائے گی بلکہ اس حکم کی غلط تعمیل کے نقصانات سے بھی آپ محفوظ رہیں گے۔

قرآنِ کریم میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ (۲/۱۸۳) "اے جماعتِ مومنین! تم پر صیام فرض قرار دیئے گئے ہیں"۔ یہ "کتاب" یعنی حکم ہے۔ اس کی غایات کے متعلق کہا۔ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ (۲/۱۸۳) لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ (۲/۱۸۵) اور وَلِتُكَبِّرُوا اللَّهَ عَلَىٰ مَا هَدَاكُمْ۔ (۲/۱۸۵)

تَتَّقُونَ سے مراد یہ ہے کہ تم میں قوانینِ خداوندی کی اطاعت کے لئے پختگی پیدا ہو جائے اور تم غلط راہوں پر چلنے کے نقصانات سے محفوظ ہو جاؤ۔ تشکرون، سے مقصود یہ ہے کہ تمہاری محنتیں بھرپور نتائج پیدا کر دیں۔ میں ان دو غایات کے متعلق سردست تفصیل میں نہیں جاؤں گا۔ قرآنِ کریم نے جو غایت الغایات

بتائی ہے اس پر مرکوز ہوں گا۔ اور وہ غایۃ الغایات یہ ہے کہ تم خدا کے بتائے ہوئے پروگرام پر عمل کرنے سے اس قابل ہو جاؤ گے کہ دنیا میں خدا کی کبریائی قائم کر سکو۔ یہ ہے روزوں کے متعلق حکمِ خداوندی کا مقصود و منتہیٰ۔ یعنی خدا کی کبریائی قائم کرنے کے قابل ہو جانا۔

لِتُكَبِّرُوا اللّٰهَ عَلٰى مَا هَدٰىكُمْ

سب سے پہلے لفظ "کبریائی" کو لیجئے۔ اس کے معنی حکومت اور اقتدار کے ہیں۔ سورۂ یونس میں ہے کہ جب حضرت موسیٰؑ اور ان کے بھائی حضرت ہارونؑ فرعون کے پاس گئے اور اس تک خدا کا پیغام پہنچایا تو اہلِ فرعون نے کہا کہ تم جو کچھ کہہ رہے ہو ہم اس کی غرض و غایت کو خوب پہنچانتے ہیں یعنی یہ کہ تَكُوْنَ لَكُمَا الْكِبْرِيَآءُ فِي الْاَرْضِ (۱۰/۷۸) "تمہارا مقصد یہ ہے کہ اس ملک میں حکومت تمہاری قائم ہو جائے۔ اقتدار تمہارے ہاتھ میں آ جائے"۔ اس سے لفظ "کبریائی" کا مفہوم واضح ہو جاتا ہے۔

(۲)

جہاں تک خارجی کائنات کا تعلق ہے اس میں خدا کا اقتدار اور اس کی حکمرانی براہِ راست قائم ہے۔ تمام کارگہِ کائنات اسی کے قوانین کے مطابق سرگرمِ عمل ہے اور اس میں کسی شے کو مجالِ انحراف نہیں یا رائے سرکشی نہیں۔ وَلَهُ الْكِبْرِيَآءُ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ (۴۵/۳۷) "کائنات کی پستیوں اور بلندیوں میں کبریائی خدا کی ہے۔ وہ زبردست غلبہ کا مالک ہے۔ لیکن اس کا غلبہ مستبد حکمرانوں کا غلبہ نہیں۔ وہ سراسر حکمت پر مبنی ہے"۔ دوسری جگہ ہے: وَهُوَ الَّذِيْ فِي السَّمَآءِ اِلٰهٌ وَّفِي الْاَرْضِ اِلٰهٌ۔ (۴۳/۸۴) "وہی آسمانوں میں بھی صاحبِ اقتدار ہے اور وہی ارض پر بھی صاحبِ اقتدار"۔ (الٰہ کے معنی صاحبِ اقتدار کے ہیں)۔

خارجی کائنات میں تو خدا کا اقتدار از خود قائم ہے۔ لیکن اس کی مشیت کا پروگرام یہ ہے کہ انسانوں کی دنیا میں اس کی کبریائی از خود انسانوں کے ہاتھوں قائم ہو۔ اسی مقصد کے لئے رسول بھیجے جاتے تھے اور رسول کے بعد اس کی ذمہ داری اس کی اُمت پر عائد ہوتی تھی۔ چنانچہ جب نبی اکرمؐ کو منصبِ نبوت پر سرفراز فرمایا گیا تو آپ کو حکم دیا گیا کہ يٰٓاَيُّهَا الْمُدَّثِّرُ "اے وہ کہ جس کی آمد سے خزاں دیدہ گلشنِ کائنات بہارِ نو کا مظہر بن جائے گا۔ (المدثر کے یہی معنی ہیں)۔ قُمْ فَاَنْذِرْ۔ "اٹھ اور نوعِ انسان کو ان کے اپنے وضع کردہ نظام ہائے حیات کی تباہ کاریوں سے آگاہ کر دے"۔ وَرَبَّكَ فَكَبِّرْ (۷۴/۱-۳)۔ "اور ان نظاموں کی جگہ اس نظام کو قائم کر جس میں کبریائی صرف خدا کے لئے ہو"۔ ——— یہ تھا منصبِ رسالت۔

دوسرے مقام پر اسی حقیقت کو جن الفاظ میں بیان کیا گیا ہے ان کی تفصیل بڑی وسعت چاہتی ہے۔ لیکن میں ان میں سے صرف دو ٹکڑوں کو نمایاں طور پر سامنے لاؤں گا۔ وَلَمْ يَكُنْ لَّهٗ شَرِيْكٌ فِي الْمُلْكِ۔ "حکومت صرف اسی کے لئے مختص ہے۔ اس میں کوئی دوسرا شریک نہیں ہو سکتا"۔ اور

اس سے آگے ہے وَكَبِّرْهُ تَكْبِيرًا۔ (۱۷/۱۱۱) "لہٰذا تم اس کی کبریائی قائم کرو"۔ اسی اعتبار سے خدا نے اپنے آپ کو ایک جگہ اَلْمُتَكَبِّرُ (۵۹/۲۳) کہا ہے۔ کہیں اَلْكَبِيرُ الْمُتَعَالِ (۱۳/۹) اور کہیں اَلْعَلِيُّ الْكَبِيرُ۔ (۲۲/۶۲) ہماری دنیا میں وہ اَلْعَلِيُّ الْكَبِيرُ کیسے قرار پاتا ہے اس کی وضاحت اس نے یہ کہہ کر کر دی کہ فَالْحُكْمُ لِلّٰهِ الْعَلِيِّ الْكَبِيرِ (۴۰/۱۲) تمہاری دنیا میں حکم صرف اس خدا کا چلنا چاہیئے جو ہر قسم کے غلبہ اور کبریائی کا مالک ہے۔

اس سے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ خدا نہ تو ہمارے سامنے آتا ہے۔ نہ وہ تختِ حکومت پر بیٹھتا ہے۔ نہ ہم اس کی آواز سنتے ہیں۔ تو ہمارے معاشرے میں اس کی حکومت کیسے قائم ہوگی؟ اس کے لئے اس نے خود ہی بتا دیا کہ ——— اس نے ہماری طرف اپنا ضابطہ احکام بھیج دیا ہے۔ جو حکومت اس ضابطہ کے مطابق قائم ہوگی اُسے خدا کی حکومت سے تعبیر کیا جائے گا۔ چنانچہ اس نے واضح الفاظ میں بتا دیا کہ

وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَا أَنْزَلَ اللّٰهُ فَأُولٰئِكَ هُمُ الْكٰفِرُونَ (۵/۴۴)

جو لوگ خدا کی کتاب کے مطابق حکومت قائم نہیں کرتے ان ہی کو کافر کہا جاتا ہے۔

(۰)

لیکن خدا کی یہ کبریائی یونہی بیٹھے بٹھائے، وعظ و نصیحت یا تقاریر و خطابات سے قائم نہیں ہو جاتی۔ جب اس کا مقصد دنیا کے ہر نظام کو اُلٹ کر اُس کی جگہ نظامِ خداوندی کو متمکن کرنا ہے تو ظاہر ہے کہ دنیا کی ہر قوم اور ہر حکومت کی طرف سے اس کی مخالفت ہوگی اور ہر مفاد پرست گروہ اس کی مزاحمت کرے گا۔ ان مخالفتوں اور مزاحمتوں کے مقابلے کے لئے میدانِ جنگ تک بھی جانا پڑے گا۔ چنانچہ قرآنِ کریم میں جماعتِ مومنین کی ان جنگوں کی غایت یہ بتائی گئی ہے۔

وَجَعَلَ كَلِمَةَ الَّذِينَ كَفَرُوا السُّفْلٰى وَكَلِمَةُ اللّٰهِ هِيَ الْعُلْيَا۔ (۹/۴۰)

اس سے مقصد یہ ہے کہ ہر غیر خداوندی نظام مغلوب ہو جائے اور خدا کا نظام جسے غالب ہونے کا حق حاصل ہے، عملاً مسلط ہو جائے۔

اس سے چند ہی آیات پہلے کہا گیا ہے:۔

هُوَ الَّذِي أَرْسَلَ رَسُولَهُ بِالْهُدٰى وَدِينِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهُ عَلَى الدِّينِ كُلِّهِ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُونَ۔ (۹/۳۳)

خدا وہ ہے جس نے اپنے رسول کو ضابطۂ ہدایت اور حق پر مبنی نظام دے کر بھیجا تاکہ یہ نظام انسانوں کے ہر خود ساختہ نظام پر غالب آجائے۔ خواہ یہ تبدیلی ان لوگوں پر کتنی ہی گراں کیوں نہ گزرے جو خالص حکومتِ خداوندی قائم نہیں کرنا چاہتے۔

یہاں صرف اتنا کہا گیا ہے کہ اس نے رسول کو اس مقصد کے لئے بھیجا۔ لیکن دیگر مقامات پر اس کی وضاحت کر دی کہ نظامِ خداوندی کا قیام تنہا رسول کے ہاتھوں سے عمل میں نہیں آئے گا۔ اس کے لئے جماعتِ مومنین کی معاونت و رفاقت بھی ضروری ہوگی۔ یعنی یہ فریضہ مُحَمَّدٌ رَّسُولُ اللّٰهِ وَالَّذِينَ مَعَهُ (۴۸/۲۹)

کے ہاتھوں سرانجام پائے گا۔

اللہ تعالیٰ نے الاعلیٰ اپنے آپ کو کہا تھا۔ لیکن جس جماعت مومنین کے ہاتھوں اس کی کبریائی دنیا میں قائم ہوتی ہے۔ اس نے انہیں اَلْاَعْلَوْنَ کہہ کر پکارا ہے۔ چنانچہ اس نے فرمایا: وَاَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ (۳/۱۳۹) "اگر تم مومن ہو اور مومن رہو گے تو دنیا میں تم ہی سب پر غالب رہو گے"۔ تمہارا قائم کردہ نظام انسانوں کے ہر خود ساختہ نظام پر غالب آجائے گا۔ اس غلبہ و تسلط کے لئے قرآن کریم نے اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ کی شرط عائد کر دی ہے۔ "یعنی اگر تم مومن ہوئے تو"۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ کیسے معلوم ہو کہ ہم مومن ہیں یا نہیں؟ اس کے لئے قرآن نے خود یہ واضح کر دیا کہ جو لوگ خدا کی کتاب کے مطابق حکومت قائم نہیں کرتے وہ مومن نہیں کافر ہیں۔ لہٰذا مومن وہ ہیں جو خدا کی کتاب کے مطابق حکومت قائم کرتے ہیں۔ اور اس کی محسوس نشانی یہ ہے کہ وہ دنیا کی ہر قوم پر غالب رہتے ہیں۔ چنانچہ اس نے واضح طور پر کہہ دیا کہ

وَلَنْ يَّجْعَلَ اللّٰهُ لِلْكٰفِرِيْنَ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ سَبِيْلًا (۴/۱۴۱)

خدا کبھی ایسا نہیں ہونے دے گا کہ غیر خداوندی نظام کی حامل قوم کو جماعتِ مومنین پر غالب آنے دے۔

لہٰذا یہ متعین کرنا بالکل آسان ہو گیا کہ ہم مومن ہیں یا نہیں؟

یہاں ایک عظیم نکتہ سامنے آتا ہے۔ خدا مومنین سے کہتا ہے کہ اَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ۔ لیکن مومن اس کی عطا کردہ اس سرفرازی کے جذبۂ تشکر کے احساس سے بے ساختہ اپنا سر زمین پر رکھ دیتا ہے اور انتہائی انکساری اور خاکساری کے عالم میں کہتا ہے کہ اَلْاَعْلٰی میں نہیں۔ سُبْحٰنَ رَبِّيَ الْاَعْلٰى ـــــ اَلْاَعْلٰى کے شایانِ شان صرف تیری ذات ہے۔ یہ تو تیری عاجز نوازیاں ہیں کہ ہمیں اَلْاَعْلَوْنَ کہہ کر پکارا گیا ہے۔ یہ علو مرتبت ہماری ذاتی نہیں، تیری عطا فرمودہ ہے۔ اگر ہمارا سر تیرے سامنے نہیں جھکتا تو یہ ساری کبریائی جو ہمیں حاصل ہوئی ہے فرعون کی فرعونیت ہے، مومن کی علو شان نہیں۔ اسی بنا پر قرآن کریم نے حق پر مبنی کبریائی اور باطل پر مبنی کبریائی میں فرق کر کے بتا دیا جب کہا:

سَاَصْرِفُ عَنْ اٰيٰتِيَ الَّذِيْنَ يَتَكَبَّرُوْنَ فِي الْاَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ۔ (۷/۱۴۶)

جو لوگ الحق کے بغیر زمین میں غلبہ اور کبریائی حاصل کر لیتے ہیں، ہم اپنے قوانین کی رو سے انہیں اس مقام سے ہٹا دیں گے۔ اور ان کی جگہ وہ قوم لے لے گی جس کی کبریائی الحق پر مبنی ہوگی۔

ـــــــــ (۰) ـــــــــ

ان تصریحات سے واضح ہو گیا کہ رسول کی غرض و غایت اور مقصود و منتہیٰ کیا تھا؟ ان کا مقصد جماعتِ مومنین کو اس کے لئے تیار کرنا تھا کہ وہ دنیا میں خدا کی کبریائی متمکن کر سکیں۔ لِتُكَبِّرُوا اللّٰهَ عَلٰى مَا هَدٰىكُمْ۔ صدرِ اوّل کی جماعتِ مومنین تیرہ برس تک مکہ کی زندگی گزارنے کے بعد مدینہ میں آئی تاکہ یہاں کی نسبتاً مساعد فضا میں نظامِ خداوندی کی بنیاد رکھ دی جائے، لیکن مخالفین نے انہیں یہاں بھی چین سے

نہ بیٹھنے دیا اور مدینہ پر حملہ کی تیاریاں شروع کر دیں۔ یہ مقام وہ مقام جب پہلی مرتبہ (۲ھ میں) روزے فرض ہوئے۔ اور ابھی سترہ دن کے روزے ہی رکھے گئے تھے کہ انہیں بدر کے میدان میں اترنا پڑا اور وہاں ان روزہ داروں نے خدا کی کبریائی کی پہلی اینٹ رکھ دی۔ آپ نے غور فرمایا کہ روزوں کی غایت کیا تھی؟ لِتُكَبِّرُوا اللّٰهَ عَلٰى مَا هَدٰىكُمْ۔ خدا کے پروگرام کے مطابق ملک میں اس کی کبریائی قائم کرنا۔ اس زمانے میں مستقل فوج (STANDING ARMY) ہنوز وجود میں نہیں آئی تھی۔ قرآنِ مجید نے تمام مؤمنین کو مجاہدین (فوج کے سپاہی) قرار دیا تھا۔ ایسا نظر آتا ہے کہ جس طرح آجکل مستقل فوج سے الگ ——— (RESERVISTS) ہوتے ہیں۔ وہ اپنا اپنا کاروبار کرتے رہتے ہیں لیکن انہیں سال میں ایک آدھ ماہ کے لئے بلا لیا جاتا ہے تاکہ وہ فوجی ٹریننگ کی تجدید کر لیں اور بوقتِ ضرورت فوج کے ہمدوش میدانِ جنگ میں نبرد آزما ہوں۔ خدا کی کبریائی کا تمکن مؤمن مجاہدین کا فریضہ تھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ رمضان کا مہینہ انہیں سپاہیانہ زندگی کا خوگر بنانے کے لئے مختص کر دیا گیا تھا۔ حضور نبی اکرمؐ سے جب سوال کیا گیا کہ مؤمن کی زندگی کیا ہے؟ تو فرمایا کہ جب جنگ ہو رہی ہو تو وہ میدانِ جنگ میں ہو اور جب جنگ نہ ہو رہی ہو تو وہ جنگ کی تیاریوں میں مصروف ہو۔

آپ نے دیکھا کہ مؤمن کی زندگی کا مقصود و منتہیٰ دنیا میں خدا کی کبریائی کو متمکن کرنا ہے اور یہی مقصد روزوں کا بتایا گیا ہے۔ اس کے لئے رمضان کے مہینے کی تخصیص کیوں کی گئی، اسے خود خدا نے یہ کہہ کر واضح کر دیا کہ۔ شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِيْٓ اُنْزِلَ فِيْهِ الْقُرْاٰنُ (۲/۱۸۵) "رمضان کا مہینہ وہ ہے جس میں نزولِ قرآن کی ابتدا ہوئی"۔ قرآنِ کریم کو اللہ تعالیٰ نے نوعِ انسان کے لئے نعمتِ عظمیٰ قرار دیا ہے اور ان سے کہا ہے کہ تم ایسی عظیم متاع کے ملنے پر جشنِ مسرت مناؤ۔

قُلْ بِفَضْلِ اللّٰهِ وَبِرَحْمَتِهٖ فَبِذٰلِكَ فَلْيَفْرَحُوْا۔ هُوَ خَيْرٌ مِّمَّا يَجْمَعُوْنَ۔ (۱۰/۵۸)۔

اے رسول! ان سے کہہ دو کہ تمہیں یہ متاعِ گراں بہا بلا مزد و معاوضہ مل گئی ہے۔ اس کے ملنے پر تم جشن مناؤ۔ تم جو کچھ بھی دنیا میں جمع کرو، یہ اس سے زیادہ گراں قدر ہے۔

لہٰذا، جسے عید الفطر کہا جاتا ہے وہ درحقیقت جشنِ نزولِ قرآن ہے۔ قرآن، خدا کی کبریائی کا ضابطۂ ہدایت ہے اور رمضان کے مہینے کے روزے مجاہدین کو خدا کی کبریائی قائم کرنے اور مستحکم رکھنے کا پروگرام۔ اس پروگرام کے بخیر و خوبی انجام پانے پر جشنِ مسرت بالکل فطری عمل ہے۔

یہ مقاصد ہیں روزوں کا مقصد۔ یعنی لتکبروا اللہ علی ما ھداکم۔ تاکہ زمین پر خدا کی حکومت قائم کی جائے۔ لیکن جب دین، مذہب میں تبدیل ہو گیا تو قرآنِ کریم کے یہ الفاظ تو باقی رہ گئے لیکن ان کی غرض و غایت بالکل بدل گئی۔ آپ قرآنِ کریم کا کوئی سا بامترجمہ نسخہ اٹھا کر دیکھیں۔ اس میں ان آیات کا ترجمہ ان الفاظ میں ملے گا۔ "تاکہ تم خدا کی بڑائی بیان کرو"۔ یعنی دین میں ان الفاظ کا مفہوم، خدا کی کبریائی قائم کرنا تھا۔ مذہب میں ان کا مطلب خدا کی بڑائی بیان کرنا رہ گیا۔ کبریائی قائم کرنے اور بڑائی بیان کرنے

میں جو فرق ہے وہ واضح ہے۔ اس "بڑائی بیان کرنے" کے حکم کی اطاعت کے متعلق کہا گیا کہ نمازِ عید میں جو چھ تکبیریں زائد کہی جاتی ہیں، ان سے اس حکم کی تعمیل ہو جاتی ہے۔ اذان۔ نماز اور عیدین کی تکبیریں اپنی اپنی جگہ بجا اور درست، لیکن یہ تکبیریں ایک بلند مقصد کے حصول کا ذریعہ، یا ایک واقعہ کا اعلان تھیں۔ یعنی اس واقعہ کا اعلان کہ یہاں خدا کی کبریائی قائم ہے۔ اس حقیقت کے وقوع پذیر ہوئے بغیر اس قسم کے اعلانات صرف چند الفاظ کا اعادہ ہیں۔ حقیقت اور اس کی رسمی ادائیگی کا یہی وہ فرق تھا جس کے احساس سے اقبالؒ کے دردمند دل نے با صد آہ و فغاں کہا تھا کہ ؎

الفاظ و معانی میں تفاوت نہیں لیکن ملا کی اذاں اور، مجاہد کی اذاں اور!
پرواز ہے دونوں کی اسی ایک جہاں میں کرگس کا جہاں اور ہے شاہیں کا جہاں اور

یہ مجاہد کی اذان تھی جو دن میں متعدد بار چھت اور مینارہ پر کھڑے ہو کر، دنیا میں اعلان کرتی تھی کہ

اَللّٰہُ اَکْبَرُ

کبریائی صرف خدا کے لئے مختص ہے۔ اس میں کوئی اور شریک نہیں ہو سکتا۔ اور اس کے بعد وہ اعلان کرتا تھا کہ

اَشْھَدُ اَنْ لَّآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ

میرا یہ اعلان اس حقیقت کی شہادت دینا ہے کہ خدا کے سوا کوئی صاحبِ اقتدار نہیں۔ آپ نے کبھی اس پر بھی غور فرمایا کہ اس اعلان میں یہ نہیں کہا گیا کہ میں اس بات کا اقرار کرتا ہوں یا اعلان کرتا ہوں۔ کہا یہ گیا کہ میں اس حقیقت کی" شہادت دیتا ہوں"۔ شہادت اسی کی قابلِ قبول ہوتی ہے جسے اس بات کا ذاتی طور پر علم ہو۔ جو اس کا عینی شاہد ہو۔ اگر کوئی شخص عدالت میں جا کر یہ کہے کہ مجھے اس واقعہ کا ذاتی طور پر تو علم نہیں۔ میرا خیال یہ ہے۔ یا میں نے ایسا سُنا ہے تو اس کی شہادت کا قابلِ قبول ہونا تو درکنار، اسے درخورِ سماعت بھی نہیں سمجھا جاتا۔ لہٰذا، اشھد ان لا الٰہ اسی کا قابلِ قبول ہوگا جو یہ کہے کہ میں اس کا گواہ ہوں کہ یہاں خدا کے سوا کوئی صاحبِ اقتدار نہیں۔ یہاں خدا کے سوا کسی کی حکومت نہیں۔ یہاں حکمرانی صرف خدا کی ہے۔ جو اس حقیقت کا شاہد نہیں اُسے اشھد ان لا الٰہ الا اللہ کہنے کا حق حاصل نہیں۔ یہی وہ شہادت ہے جس کے متعلق خود اللہ تعالیٰ نے فرمادیا کہ شَھِدَ اللّٰہُ اَنَّہٗ لَآ اِلٰہَ اِلَّا ھُوَ۔ "خدا اس کی شہادت دیتا ہے کہ اس کے سوا کوئی صاحبِ اقتدار نہیں ہے"۔ وَالْمَلٰٓئِکَۃُ "اور ملائکہ جو اس کے اس اقتدار کو بروئے کار لانے کے لئے مامور ہیں وہ بھی اس کی شہادت دیتے ہیں"۔ انہیں بھی اس کا حق حاصل ہے کہ وہ بھی اس کی شہادت دیں، کیونکہ وہ اس کے عینی شاہد ہیں۔ اس کے بعد ہے، وَاُولُوا الْعِلْمِ قَآئِمًا بِالْقِسْطِ۔ "ان کے علاوہ وہ لوگ بھی اس کی شہادت دے سکتے ہیں جنہیں اس کا علم بھی حاصل ہے اور پھر وہ ایسا نظام متشکل کئے ہوئے ہیں جس میں خدا کی میزانِ عدل قائم ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو اپنے ذاتی علم اور مشاہدہ کی بنا پر یہ کہہ سکتے ہیں کہ لَآ اِلٰہَ اِلَّا ھُوَ الْعَزِیْزُ الْحَکِیْمُ (۳/۱۸)" خدا کے سوا کوئی صاحبِ اقتدار نہیں اور اس کا اقتدار

تنہا قوت پر نہیں، بلکہ قوت کے ساتھ حکمت پر مبنی ہے۔"

آپ نے غور فرمایا کہ ——— قرآنِ کریم کی رو سے اللہ اکبر کہہ کر کا حق کسے حاصل ہے؟ رمضان کے روزے جماعتِ مومنین کو اس قابل بنا دینے کے لئے تھے کہ وہ ملک میں خدا کی کبریائی قائم کریں اور پھر ساری دنیا کے سامنے اس کی شہادت دے سکیں۔

یہ ہے عزیزانِ من، میری قرآن بصیرت کے مطابق صیام کی غرض و غایت اور رمضان کا مقصود و منتہیٰ۔

والسلام

ربنا تقبل منا انک انت السمیع العلیم۔

(۰)

(یہ ہوتا ہے انداز محترم پرویز صاحب کے درسِ قرآن کا۔ یہ درس ۲۵/بی، گلبرگ ۲ لاہور، میں ہر جمعہ کی صبح بالمشافہ ہوتا ہے، اور مختلف شہروں کی بزم ہائے طلوعِ اسلام کے زیرِ اہتمام "ٹیپ ریکارڈر" پر۔ انفرادی طور پر حسبِ فرمائش، ان درسوں کے ٹیپ (CASSETTES) بھی مہیا کئے جا سکتے ہیں۔ (ناظم ادارہ طلوعِ اسلام لاہور)۔

بقیہ:۔ باب المراسلات

۸۔ بیت المال سے کیا مراد ہے؟

اسلامی مملکت کے خزانہ کو بیت المال کہا جاتا تھا۔ یعنی جہاں حکومت کی آمدنی جمع ہو۔ گورنمنٹ کی آمدنی کے لئے خزانہ (GOVT: EXCHEQUER) اور مذہبی آمدنی کے لئے بیت المال کی اصطلاحات ہمارے دورِ ملوکیت کی وضع کردہ ہیں جب مذہب اور حکومت میں ثنویت (DUALITY) پیدا ہو گئی تھی۔ اسلامی مملکت میں یہ ثنویت نہیں ہوتی۔ اس میں جو کچھ خدا کی طرف منسوب کیا جاتا ہے وہ درحقیقت اسلامی مملکت کے لئے ہوتا ہے کیونکہ وہ خدا کی عائد کردہ ذمہ داریوں کو پورا کرنے کے لئے وجود میں آتی ہے۔

اسی طرح زکوٰۃ اور انکم ٹیکس کے متعلق یہ کہنا کہ انکم ٹیکس حکومت کا ٹیکس ہے اور زکوٰۃ خدا کا ٹیکس، اُسی دورِ ملوکیت کی ثنویت کی یادگار ہے جس کی طرف اوپر اشارہ کیا گیا ہے۔ پاکستان کے مطالبہ کی بنیادی دلیل یہ تھی کہ اسلام میں مملکت اور مذہب دو الگ الگ چیزیں نہیں۔ اسلامی حکومت دین کی بنیادوں پر استوار ہوتی ہے اس لئے اس میں مذہب الگ حیثیت نہیں رکھتا۔ زکوٰۃ کی آمدنی کو حکومت کی دوسری آمدنی سے الگ قرار دینا پاکستان کی وجہِ جواز کو ختم کر دیتا ہے۔ زکوٰۃ تو ہندوستان کے مسلمان اب بھی نکالتے ہیں۔ فرق یہ ہے کہ وہاں کے مسلمان خود ہی زکوٰۃ نکالتے ہیں اور اُسے خود ہی مستحقین پر خرچ کر دیتے ہیں۔ پاکستان میں زکوٰۃ کے ایک حصّہ کو حکومت نے وصول کیا ہے اور دوسرے حصّے کے متعلق کہا ہے کہ اسے مسلمان خود ہی نکالیں اور خود ہی مستحقین میں تقسیم کر دیں۔

محترم پرویز صاحب کا
درسِ قرآن

بزمِ طلوعِ اسلام لندن (انگلینڈ)
ہر ماہ کے پہلے اتوار کو ڈھائی بجے دوپہر (بذریعہ ٹیپ)

149 SUTTON COURT RD
LONDON E-13 — 9NR.
PHONE 01 — 552-1517

لاہور میں ہر جمعہ ۹ بجے صبح (فون ۸۸۰۸۰۰)
۲۵/ بی گلبرگ ۲ (نزد پولیس اسٹیشن)

فیصل آباد میں ہر جمعہ ۵ بجے شام (بذریعہ ٹیپ)
حیات سرجری کلینک ۲۳ - پیپلز کالونی I
(فون نمبر ۲۴۴۵۵)

کراچی ہر جمعہ کو ۹ بجے صبح (بذریعہ ٹیپ) کتب خانہ
بزمِ طلوعِ اسلام - کمرہ ۲۴ ہارون چیمبرز
الطاف حسین روڈ - نیوچالی کراچی ۲ - فون نمبر ۲۳۸۸۲۸

گوجرانوالہ میں ہر جمعہ ۵/۲ بجے شام (بذریعہ ٹیپ) رہائش گاہ
چوہدری مقبول شوکت - گل روڈ سول لائنز
(بالمقابل پرانا ریلوے اسٹیشن)

پشاور میں ہر جمعہ ۹ بجے صبح (بذریعہ ٹیپ) برمکان - آغا
محمد یونس صاحب - رفیقی لین صدر - بالمقابل وی آئی پی
مین گیٹ - پشاور سٹیڈیم - بارہ روڈ (فون ۵۹۶۶)

گجرات میں ہر جمعہ بعد نمازِ جمعہ نیز بروز اتوار ۴ بجے شام
بمقام ۱۲/۱/ب بھمبر روڈ (بذریعہ ٹیپ)

مردان میں ہر جمعہ ۵ بجے شام (بذریعہ ٹیپ)
برمکان ڈاکٹر رضا محمد خاں - نواب علی روڈ

جلال پور جٹاں میں ہر جمعہ بعد نمازِ جمعہ (بذریعہ ٹیپ)
دفتر بزمِ طلوعِ اسلام (بازار کلاں)

راولپنڈی
میں ہر جمعہ ۵ بجے شام (بذریعہ ٹیپ)
جی ۱۲۶ - لیاقت روڈ

ملتان میں ہر جمعہ ۹ بجے صبح (بذریعہ ٹیپ)
دفتر شاہ سنز ہیڑن پاک گیٹ - (فون ۳۱۰۰۷)

لیہ (بذریعہ ٹیپ) ہر جمعہ بعد نمازِ مغرب
رہائش گاہ ڈاکٹر اظہر ملک صاحب سرکلر روڈ - لیہ

پنج کسی (تحصیل کبیر والا ضلع ملتان) میں ہر جمعہ (بذریعہ ٹیپ) بوقت ۳ بجے شام
بمقام مطب حکیم احمد الدین صاحب
نمائندہ بزمِ طلوعِ اسلام

ہنگو میں درسِ قرآن (بذریعہ ٹیپ) ہر جمعہ شام ساڑھے پانچ بجے برمکان محمد جمیل صاحب واقع ریلوے روڈ ہنگو - فون نمبر ۶

کراچی کے خریدار متوجہ ہوں!

کتب خانہ کے اوقاتِ کار حسبِ ذیل ہیں
ہر روز علاوہ جمعہ :- شام ۶ بجے تا ۸ بجے شب
جمعہ :- صبح ۹ بجے تا ۱۲ بجے دوپہر

نیز کتب خانہ میں ادارہ طلوعِ اسلام کی
مطبوعات بھی دستیاب ہیں اور ایک کارڈ تحریر
کر کے منگوائی بھی جا سکتی ہیں

محمد اسلام - کتب خانہ بزمِ طلوعِ اسلام
کمرہ نمبر ۲۴ - ہارون چیمبرز
الطاف حسین روڈ - نیو چالی
کراچی ۲
(فون نمبر ۲۳۸۸۲۸)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

پیامِ عید

(قرآن کی عظمت)

نہ ہو نومید، نومیدی زوالِ علم و عرفاں ہے

(پرویز صاحب کا درسِ قرآن مجید جو ۱۹۷۳ء کی تقریبِ عید پہ دیا گیا)

عزیزانِ گرامی قدر! سلام و رحمت۔

یوں تو ہمارا ہر درس، درسِ قرآن مجید ہوتا ہے جس میں، میں اپنے علم و بصیرت کی حد تک، خدا کی اس کتابِ عظیم کے حقائق و معارف، اصول و احکام اور قوانین و اقدار آپ احباب کے سامنے پیش کرتا ہوں، لیکن رمضان کے مبارک و مسعود مہینہ کا آخری درس۔ التزاماً، اس ضابطہ ہدایت کی عظمت و انفرادیت کو اجاگر کرنے کے لئے مختص کر لیا جاتا ہے کیونکہ یہ وہ مہینہ ہے جس میں اس سرچشمۂ نور و بصائر کے نزول کا آغاز ہوا۔ اس باعظمت مہینہ کا اختتام اس پُرمسرت تقریب پر ہوتا ہے جسے عید کہا جاتا ہے۔ جیسا کہ آپ احباب کو معلوم ہے عید درحقیقت جشنِ نزولِ قرآن ہے جس کے منانے کا حکم خود اس کتاب کے نازل کرنے والے، ربّ العرش نے دے رکھا ہے۔ جب کہا کہ قُلْ بِفَضْلِ اللّٰهِ وَبِرَحْمَتِهٖ فَبِذٰلِكَ فَلْيَفْرَحُوْا ۭ هُوَ خَيْرٌ مِّمَّا يَجْمَعُوْنَ۔ (۱۰/۵۸) یہ محض خدا کا فضل اور اس کی رحمت ہے جو اس جیسی کتاب تمہیں مل گئی۔ دنیا کی ہر متاع اس کے سامنے ہیچ ہے۔ لہٰذا، اس عطیہ خداوندی کے ملنے پر جشنِ مسرت مناؤ۔

میں نے اس تقریبِ انبساط انگیز کے سلسلہ میں کچھ عرصہ پہلے ایک درس میں کہا تھا کہ ہم اس جشن کو ہندوستان میں بھی منایا کرتے تھے لیکن وہ محض ایک رسم تھی جسے پورا کر لیا جاتا تھا —— غلامی کی زنجیروں میں جکڑی ہوئی قوم کی تقدیر میں جشنوں کی مسرتیں کہاں؟ یہی وہ کرب انگیز حقیقت تھی جسے علامہ اقبالؒ نے ان ہر گداز لیکن بصیرت افروز الفاظ میں بیان کیا تھا کہ

عیدِ آزاداں شکوہِ ملک و دیں
عیدِ محکوماں، ہجومِ مومنین

برسوں کی تگ و تاز کے بعد ہماری محکومی کی زنجیریں ٹوٹیں اور ہمیں آزادی کی فضا میں اذنِ بال کشائی ملا۔ یہ عجیب حسنِ اتفاق تھا کہ ہمیں یہ نوید آزادی رمضان کے مہینے میں ملی، اور ایک آزاد قوم کی حیثیت سے پہلی عید اگست ۱۹۴۷ء میں، اعلانِ آزادی کے تین ہی دن بعد دیکھنی نصیب ہوئی۔ بے شک وہ عید، عیدِ آزاداں تھی

لیکن اس وقت ہم ایک عجیب کشمکش میں گرفتار تھے۔ ایک طرف حصولِ آزادی اور عیدِ آزادی کے نشاط آفریں اور طرب آگیں احساسات و جذبات اور دوسری طرف، ہندوستان سے آنے والے ہمارے قافلوں کا قتلِ عام اور بقیۃ السیف، خانماں برباد، متاعِ بُردہ، دشت نوردوں کی تباہ حالی اور بے سروسامانی! وہ عید اژدھامِ مسرت و شادمانی کے روح پرور اور ہجومِ مصائب و آلام کے جاں فرسا آمیزہ کی تقریب تھی۔ مجھے وہ نمازِ عید آج تک یاد ہے ـــــ اور ہمیشہ یاد رہے گی۔ جسے میں نے کراچی کی پرانی، مختصر سی، عیدگاہ کے باہر، سڑک پر قائدِ اعظمؒ سے پچھلی صف میں اس انداز سے ادا کی تھی کہ سر، حصولِ آزادی کے شکرانہ میں وقفِ سجود تھا، لیکن دل اندوہ گینیوں اور ملال آفرینیوں کے ہجوم میں طلسمِ پیچ و تاب۔ نماز کے بعد عید ملنے والوں کے انبوہ میں خود قائدِ اعظمؒ کی بھی یہ کیفیت تھی کہ ـــــ چہرہ میں ٹیس لب ہنسنے پہ مجبور۔

اس میں شبہ نہیں کہ شدائد و نوائب کی جو قیامت ہم پر اُس وقت ٹوٹ پڑی تھی، عید کا چاند اس کے غبار میں گم ہو کر رہ گیا تھا لیکن اس کے باوجود، ہمارے درخشندہ و تابناک مستقبل کی اُمید کی شعاعیں تھیں جو ہمارے تصوّرات کی راتوں کو تاریک نہیں ہونے دیتی تھیں۔ اور افق سے اُس پار، ندائے جمال تھی جو پکار پکار کر کہہ رہی تھی کہ لَا تَهِنُوْا ـــــ وَلَا تَحْزَنُوْا ـــــ وَ اَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ ـــــ مت گھبراؤ۔ خوف نہ کھاؤ۔ فطرت کے اس اٹل قانون پر نگاہ رکھو ـــــ کہ خونِ صد ہزار انجم سے ہوتی ہے سحر پیدا۔

اس عید کی ماتم سامانیوں اور سیاہ پوشیوں کو ہم نے ان تابندہ اُمیدوں کے سہارے برداشت کر لیا، لیکن کس قدر جگر پاش اور جانسوز ہے یہ حقیقت کہ چھبّیس سال کے عرصہ میں، ہمیں ایک عید بھی ایسی دیکھنی نصیب نہ ہوئی جسے "عیدِ آزادی" تو ایک طرف، اپنے دورِ غلامی کی، "عیدِ محکومی" بھی کہا جا سکے۔ اس کے برعکس ہر سال، عید کا چاند ہمارے لئے سالِ گزشتہ سے بھی بڑھ کر پیغامِ حزن و ملال لایا اور اب تو کیفیت یہ ہو چکی ہے کہ

ہلالِ عید ہماری ہنسی اڑاتا ہے

"عیدِ آزادی" اور "عیدِ محکومی" کا تقابل تو اقبالؒ نے کیا تھا۔ لیکن (میرا خیال ہے کہ) ہمارے جیسی عیدِ سوگواران و ماتم گساران کا تصوّر اس کے افقِ خیال میں بھی نہیں آیا ہوگا۔ اچھا ہوا وہ اس سے پہلے یہاں سے چلا گیا۔ وہ بھی اور قائدِ اعظمؒ بھی۔ شاید ان کے حسنِ نیت اور صدق و خلوص کا یہی صلہ مناسب خیال کیا گیا ہو!

ساری دُنیا تاریکی میں

لیکن اگر ہم اہلِ پاکستان شبِ زندگی کی ہولناک تاریکیوں میں گھرے ہوئے ہیں، تو اس کی سحرِ تاباں کی نمود اور بھی تو کہیں نہیں! اس وقت ہم تاریخ کے اُس دور سے گزر رہے ہیں جس میں ساری نوعِ انسان انتہائی درد و کرب میں مبتلا ہے۔ ہم طبیعی بربادیوں اور قلبی اضطرابیوں، دونوں کا شکار ہیں لیکن جو قومیں طبیعی طور پہ کامیاب و کامران ہیں قلبی طور پہ وہ بھی جہنم

سلہ یہ درس ۱۹۷۳ء میں دیا گیا تھا۔

کے اس عذاب میں مبتلا ہیں جس کے متعلق قرآن نے کہا تھا کہ نَارُ اللّٰہِ الْمُوْقَدَۃُ الَّتِیْ تَطَّلِعُ عَلَی الْاَفْئِدَۃِ۔ (۱۰۴/۶-۷)۔ خدا (کے قانونِ مکافات) کی جلائی ہوئی آگ جس کے شعلے دلوں کو اپنی لپیٹ میں لے لیتے ہیں۔ اس وقت کیفیت یہ ہے کہ دنیا کی چھوٹی چھوٹی قومیں، اگر بڑی بڑی قوموں سے خائف ہیں تو بڑی بڑی قومیں ایک دوسرے سے لرزاں و ترساں ہیں۔ جنگل کے ہرن اگر بھیڑیوں سے ڈر رہے ہیں تو بھیڑیے ایک دوسرے کی تاک میں بیٹھے ہیں۔ اطمینان نہ انہیں میسّر ہے نہ انہیں نصیب۔ ہم جن قوموں کے ہاں اپنے دکھوں کا مداوا مانگنے جاتے ہیں، ان کے زخموں پر سے حریری پٹیاں ہٹا کر دیکھئے تو وہ کچھ کم رستے ہوئے ناسور دکھائی نہیں دیں گے۔ غالبؔ کے الفاظ میں :-

ہوئی جن سے توقع خستگی کی داد پانے کی ۔۔۔ وہ ہم سے بھی زیادہ خستۂ تیغِ ستم نکلے

لیکن ہماری جگر سوزی اس لحاظ سے ان سے زیادہ کرب انگیز ہے کہ ہم ذلیل و خوار بھی ہو گئے ہیں —— حتیٰ کہ ان قوموں کے سامنے بھی ذلیل و خوار، جو دنیا میں سب سے زیادہ ذلیل و خوار شمار ہوتی تھیں۔ اور اس سے بھی آگے بڑھ کر یہ کہ ہم اپنے آپ کو خود اپنی نگاہوں میں بھی ذلیل محسوس کرنے لگ گئے ہیں۔ یہ وہ ذلت ہے جسے قرآن نے شدید ترین عذاب قرار دیا ہے جب کہا ہے کہ وَتَرْهَقُهُمْ ذِلَّةٌ۔ ان پر ذلت چھا جائے گی، كَاَنَّمَآ اُغْشِيَتْ وُجُوْهُهُمْ قِطَعًا مِّنَ الَّيْلِ مُظْلِمًا (۱۰/۲۷)۔ ایسی ذلت جیسے کسی نے ان کے چہرے پر سیاہ رات کی کالک مل دی ہو۔ یہ ہیں ہمارے وہ چہرے جن کے ساتھ ہم اس عید کا استقبال کرنے کے لئے نکلے ہیں!

نامساعد حالات کی ان اندوہناکیوں کے متعلق دو آراء نہیں ہو سکتیں۔ اس وقت پاکستان کا ہر مسلمان اس ملک اور اپنے مستقبل کے متعلق سراسیمہ نظر آتا ہے۔ جب یہاں کے عام باشندوں کی یہ حالت ہے تو آپ میرے جیسے انسان کی قلبی کیفیات کا اندازہ لگائیے کہ جس نے گذشتہ تیس چالیس سال سے اس پودے کو خونِ جگر کے ایک ایک قطرے سے سینچا ہو، اور وہ اپنی عمر کے آخری دور میں اس کا یہ انجام دیکھ رہا ہو۔ پھر میرے لئے، عزیزانِ من! یہ سوال ایک ملک یا ایک مملکت کے عروج و زوال کا نہیں۔ میرے نزدیک تو یہ ملک اور اس میں آزاد مملکت ایک بلند مقصد کے حصول کا ذریعہ تھے (اور ہے)۔ اور وہ بلند مقصد تھا دین کا قیام، یعنی ابتداءً ایک مختصر سے خطۂ زمین ہی میں سہی، صدیوں کے بعد قرآنی نظام کا قیام۔ لہٰذا، میرے لئے اس مملکت میں انتشار اور اس کا ضعف انسانیت کے لئے دین و دنیا دونوں کے خسارہ کا موجب ہے۔ اس سے آپ میرے قلبِ حزیں کے کرب و الم کا تصور کر سکتے ہیں۔

لیکن اس کے باوجود، برادرانِ گرامی قدر! میں مایوس نہیں —— میں جانتا ہوں کہ اس قسم کے الفاظ عام طور پر رسماً بول دیئے جاتے ہیں۔ یہ نہ کہنے والوں کے دل سے ابھرتے ہیں، نہ سننے والوں کے قلب کی گہرائیوں میں اترتے ہیں۔ لیکن میں تو ان الفاظ کو کسی پبلک پلیٹ فارم سے نشر نہیں کر رہا۔ میں انہیں بارگاہِ قرآنی میں کھڑا،

قرآن کا طالب العلم مایوس نہیں ہو سکتا

خلائق اس کتابِ عظیم کو سامنے رکھ کر کہہ رہا ہوں جہاں ایک ایک لفظ میزانِ عدل میں تولا جاتا اور کہنے والوں کی

ذمہ داریوں کو پرکھا جاتا ہے۔ اس لئے مجھ میں اور اُن حضرات میں بنیادی فرق ہے۔

اور دل کا ہے پیام اور، میرا پیام اور ہے — عشق کے درد مند کا، طرزِ کلام اور ہے

میں قرآن حکیم کا طالب علم ہوں۔ اور جس کی نگاہوں کے سامنے قرآن کھلا ہو، وہ کبھی مایوس نہیں ہو سکتا۔ مجھے اس کا بھی احساس ہے کہ اس مقام پر پھر یہ کہہ دیا جائے گا کہ قرآن کے متعلق بھی اس قسم کی باتیں محض برسبیلِ عقیدت کہہ دی جاتی ہیں۔ یہ بھی ٹھیک ہے۔ لیکن عقیدت اور عقیدت میں بھی فرق ہوتا ہے۔ ایک عقیدت اندھی تقلید پر مبنی ہوتی ہے، اور ایک عقیدت، غور و فکر، علم و بصیرت۔ اور دلائل و براہین کا اطمینان بخش نتیجہ۔ میری زندگی کا ابتدائی حصہ اندھی عقیدت کا تھا۔ اس زمانے میں، میں بھی اس قسم کی باتیں، محض تقلیداً کہا کرتا تھا، اس کے بعد میری زندگی کا تنقیدی دور آیا، جس میں اندھی عقیدت کا تراشیدہ ایک ایک بُت پاش پاش ہو کر رہ گیا۔ یہ لاؔ کا دور تھا جس میں ہر اس عقیدے کی نفی ہوتی چلی گئی جسے بلا سوچے سمجھے اختیار کر رکھا تھا۔ اور اس کے بعد میری زندگی کا تیسرا دور شروع ہوا جس میں، میں نے جس عقیدہ کو مانا، علیٰ وجہ البصیرت مانا۔ اس طرح میں، یوں کہئے، کہ قرآنِ عظیم کی صداقتوں پر از سرِ نو ایمان لایا۔ لہٰذا، اب میں اگر قرآن کے متعلق کچھ کہتا ہوں۔ تو وہ اندھی عقیدت پر مبنی نہیں ہوتا، بلکہ اُس یقین پر مبنی ہوتا ہے جو علم و بصیرت کا پیدا کردہ ہے۔ اور یہی ہے وہ یقین جس کی بنا پر میں پکار کر کہتا ہوں کہ جس کے سامنے قرآن کھلا ہو، وہ کبھی مایوس نہیں ہو سکتا۔

انسان مایوس کب ہوتا ہے

آپ کو معلوم ہے کہ انسان پر مایوسی کس وقت طاری ہوتی ہے؟ اسے ایک مثال سے سمجھئے۔ آپ کسی لق و دق صحرا میں سفر کر رہے ہوں، اس طرح کہ نہ کوئی رفیق ساتھ ہو، نہ زادِ راہ پاس۔ راستہ بے حد دشوار گذار ہو اور منزل بڑی کٹھن۔ یہ تمام حالات ایسے ہیں جن میں مسافر پریشان ہو جاتا ہے۔ لیکن اگر صورت یہ ہو کہ جس راستے پر آپ جا رہے ہوں، اس کے صحیح ہونے پر آپ کو یقین ہو، تو آپ ان صعوباتِ سفر کے باوجود مایوس نہیں ہوں گے۔ اس کے برعکس اگر کیفیت یہ ہو کہ اس صحرا میں آپ راستہ کھو جائیں۔ نہ کوئی نشانِ منزل آپ کے سامنے ہو اور نہ ہی کوئی بتانے والا۔ تو آپ راستے کی ناکام تلاش کے بعد جب تھک کر بیٹھ جائیں گے تو اس وقت آپ پر مایوسی طاری ہو جائے گی۔ لہٰذا، انسان مایوسی کا شکار اس وقت ہوتا ہے جب اسے مشکلات سے نکلنے کا کوئی راستہ نہ ملے۔ اس حقیقت کو قرآن کریم نے ان چار مختصر الفاظ میں بیان کر دیا ہے جب کہا کہ وَمَنْ يَّقْنَطُ مِنْ رَّحْمَةِ رَبِّهٖٓ اِلَّا الضَّآلُّوْنَ (۱۵/۵۶)۔ خدا کی رحمت سے صرف وہ لوگ ناامید ہوتے ہیں جنہوں نے راستہ کھو دیا ہو۔ یہاں اس حقیقت کو ایک اصولی نکتہ کی حیثیت سے بیان کیا گیا ہے۔ دیگر مقامات پر اس اجمال کی تفصیل دی گئی ہے۔ ایک جگہ کہا ہے کہ اگر صورت یہ ہو کہ ایک رہ نورد، اپنا راستہ بھول گیا ہو۔ کوئی راہ نما اسے نشاناتِ راہ کا پتہ نشان بتا دے، وہ نشانات اس کے سامنے بھی آ جائیں لیکن وہ انہیں صحیح ماننے سے انکار کر دے۔ تو ظاہر ہے کہ وہ بھی منزل تک نہیں پہنچ سکے گا۔ بدستور مایوسیوں کا شکار رہے گا۔ سورہ عنکبوت میں ہے: وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِاٰيٰتِ اللّٰهِ

وَلِقَآئِہٖۤ اُولٰٓئِکَ یَئِسُوۡا مِنۡ رَّحۡمَتِیۡ (۲۹/۲۳)۔ جو لوگ خدا کے متعین کردہ نشاناتِ راہ کو صحیح تسلیم کرنے سے انکار کر دیں اور یوں اس تک پہنچنا ہی نہ چاہیں، وہ بھی خدا کی رحمت سے مایوس رہتے ہیں۔ قرآن ہمیں بتاتا ہے کہ سفرِ زندگی میں یہ صورت نہیں کہ انسان کو دشت نوردی اور بادیہ پیمائی کے لئے تنہا چھوڑ دیا گیا ہو اور اسے منزل تک لے جانے والے راستے کا پتہ نشان ہی نہ بتایا گیا ہو۔ قطعاً نہیں۔ یہ تو خدا کے خدا ہونے کے منافی ہے۔ دیکھئے اس نے کس حتم و یقین سے کہا ہے کہ کَتَبَ عَلٰی نَفۡسِہِ الرَّحۡمَۃَ۔ (۶/۱۲)۔ اس نے رحمت کو اپنے اوپر واجب قرار دے رکھا ہے۔

ان آیات میں آپ دیکھئے۔ قرآن کریم نے کہا کہ خدا نے رحمت کو اپنے اوپر واجب قرار دے رکھا ہے اور

رحمت کیا ہے

رحمت سے مایوسی کفر ہے۔ سوال یہ ہے کہ یہ رحمت کیا ہے جسے خدا نے اپنے اوپر واجب قرار دے رکھا ہے اور اس سے مایوسی کفر ہے۔ یا یوں کہئے کہ اُس سے انکار کا نتیجہ ضلالت ہے۔ یعنی اس سے سفرِ حیات میں راستے گم ہو جاتے ہیں اور راستہ گم ہو جانے سے مایوسی پیدا ہو جاتی ہے۔ اس کا جواب خود خدا نے یہ کہہ کر دیا ہے کہ یہ رحمت خود قرآن مجید ہے۔ متعدد آیات میں قرآن کو رحمۃ کہا گیا ہے۔ مثلاً سورہ اعراف میں ہے۔ وَلَقَدۡ جِئۡنٰہُمۡ بِکِتٰبٍ فَصَّلۡنٰہُ عَلٰی عِلۡمٍ ہُدًی وَّ رَحۡمَۃً لِّقَوۡمٍ یُّؤۡمِنُوۡنَ (۷/۵۲) ہم نے ان کی طرف ایک کتاب بھیجی ہے جسے علم کی روشنی میں واضح کر دیا ہے۔ جو لوگ اس کی صداقت پر یقین رکھتے ہیں، وہ ان کی راہ نمائی صحیح منزل کی طرف کر دیتی ہے۔ اور اسی جہت سے وہ رحمت ہے۔ دوسری جگہ اسے ھُدًی وَّ رَحۡمَۃً وَّ بُشۡرٰی (۱۶/۸۹) کہا گیا ہے۔ یعنی صحیح منزل کی طرف راہ نمائی کرنے والی۔ راہ سپرو رہ حیات کو خوش خبریاں دینے والی کہ ہر قدم پر منزل اس سے قریب تر ہوتی چلی جا رہی ہے، اور اس طرح اس کے لئے آیۂ رحمت بننے والی۔ آپ نے کبھی اس نکتہ پر بھی غور فرمایا ہے جو قرآن میں آیا ہے کہ اَلرَّحۡمٰنُ عَلَّمَ الۡقُرۡاٰنَ (۵۵/۱-۲) قرآن کی تعلیم خدائے رحمٰن نے دی ہے۔ اس میں خدا کی صفت رحمانیت کو اُبھار کر اسی لئے سامنے لایا گیا ہے کہ قرآن کو رحمت قرار دیا گیا ہے اور یہ ظاہر ہے کہ رحمۃ کو رحمٰن ہی عام کر سکتا تھا۔

قرآن کا مقام

پھر جس طرح قرآن کی تعلیم خود خدائے رحمٰن نے دی، اسی طرح یہ بھی خدا ہی نے بتایا کہ قرآن کا مقام کیا ہے۔ اور ظاہر ہے کہ یہ بات بھی خدا ہی بتا سکتا تھا کیونکہ یہ اُسی کی کتاب ہے اور جیسا کہ کہا گیا ہے "تصنیف را مصنف نیکو کند بیاں"۔ اس کتاب کا تعارف خدا سے بہتر کون کرا سکتا تھا ——— اور پھر کتاب بھی ایسی جس کے متعلق (گویا) اس نے خود کہہ دیا ہو۔ کہ "تراکشید و دست از قلم کشید خدا ——— نوعِ انسان کے لئے مکمل۔ غیر متبدل اور آخری ضابطۂ ہدایت کے معنی ہی یہ ہیں۔ کہ جہاں تک عالمِ انسانیت کا تعلق ہے، اس کے بعد خدا نے "کوئی اور کتاب رقم نہیں فرمائی"۔

قرآن کے مقام کے تعارف کے لئے خدا نے کہا ہے کہ تم غور کرو کہ یہ کارگہِ کائنات بغیر کبھی خلل اور فساد کے کس نظم و ضبط اور حسن و خوبی سے چلا جا رہا ہے۔ یہ اس لئے کہ کائنات کی ہر شے اس قانون کی پابند ہے جو اس کے لئے وضع کیا گیا ہے۔ وہ قوانین کتابِ فطرت میں منقوش ہیں۔ اور اسی قسم کے قوانین جو انسانوں کے

لئے متعین کئے گئے ہیں، اس کتابِ مبین میں درج ہیں۔ اس لئے وہ اس کتاب کی عظمت و رفعت کو سامنے لانے کے لئے، خارجی کائنات کے مظاہر کو بطورِ شہادت پیش کرتا ہے۔ (مثلاً) سورۂ واقعہ میں ہے فَلَآ اُقۡسِمُ بِمَوٰقِعِ النُّجُوۡمِ۔ ان سے کہو کہ نہیں! بات یہ نہیں کہ میں ان بسیط حقائق کو یونہی نظری طور پر بیان کرکے آگے بڑھ جاؤں گا۔ میں انہیں کائنات کے محسوس نظام کی مرئی مثالوں سے سمجھاؤں گا۔ اس ضمن میں میں سب سے پہلے ستاروں کی گزرگاہوں کو بطورِ شہادت پیش کرتا ہوں: وَاِنَّہٗ لَقَسَمٌ لَّوۡ تَعۡلَمُوۡنَ عَظِیۡمٌ۔ اور اگر تم علم و بصیرت کی بارگاہ سے دریافت کرو تو تمہیں معلوم ہو جائے کہ یہ شہادت کتنی عظیم شہادت ہے۔ (۵۶/۷۵-۷۶)

میں ستاروں کی گذرگاہوں ــــ ان کے طلوع و غروب کے مواقع ــــ کو اس حقیقتِ کبریٰ کی صداقت کے لئے بطورِ شہادت پیش کرتا ہوں کہ

اِنَّہٗ لَقُرۡاٰنٌ کَرِیۡمٌ (۵۶/۷۷)

یہ قرآن بڑے شرف و مجد کا حامل اور نوعِ انسان کے لئے بے حد نفع رساں اور عزت بخش ہے۔ خود واجب التکریم اور جو اسے راہ نما بنا لے، اسے واجب التکریم بنا دینے کا ضامن اور کفیل۔

سورۂ تکویر میں اس اجمال کو ذرا تفصیل سے بیان کیا گیا ہے جہاں فرمایا کہ فَلَآ اُقۡسِمُ بِالۡخُنَّسِ الۡجَوَارِ الۡکُنَّسِ۔ نہیں! میں شہادت میں پیش کرتا ہوں ان سیاروں کو جو پچھلے پاؤں لوٹ جاتے ہیں اور انہیں بھی جو ایک برق یا غزالہ کی طرح تیزی سے آگے بڑھ کر چھپ جاتے ہیں: وَالَّیۡلِ اِذَا عَسۡعَسَ وَالصُّبۡحِ اِذَا تَنَفَّسَ۔ اور شہادت میں پیش کرتا ہوں رات کو جب وہ نہایت آہستہ دبے پاؤں آتی ہے اور اسی طرح خاموشی سے دبے پاؤں لوٹ جاتی ہے۔ اور صبح کو جب وہ اپنی مسیحا نفسی سے ساری دنیا کو حیاتِ نو کا پیام دینے کے مشرق کے جھروکے سے نمودار ہوتی ہے۔

میں شہادت میں پیش کرتا ہوں ان تمام کائناتی شواہد کو اس حقیقتِ کبریٰ کی تبیین کے لئے کہ

اِنَّہٗ لَقَوۡلُ رَسُوۡلٍ کَرِیۡمٍ (۸۱/۱۹)

جس شخص کی زبان سے تم اس قرآن کو سن رہے ہو وہ ہمارا بھیجا ہوا قاصد ہے اور نہایت معزز اور واجب التکریم قاصد۔ یعنی یہ پیغام (قرآن) بھی اَلۡکَرِیۡمُ (۵۶/۷۷) اور اس کا لانے والا بھی اَلۡکَرِیۡمُ (۸۱/۱۹) اور جس (خدا) نے اسے بھیجا ہے وہ بھی اَلۡکَرِیۡمُ (۲۳/۱۱۶)

سورۂ الطارق میں ہے: وَالسَّمَآءِ ذَاتِ الرَّجۡعِ (۸۶/۱۱)۔ یہ فضائی کرّے جو اس قدر عظیم الجثہ ہونے کے باوجود

ارض و سما کی شہادت

اس حسن و خوبی سے اپنے اپنے افلاک میں تیرتے پھرتے ہیں (۳۶/۴۰) اور اپنی گردش سے زندگی کے نئے نئے پہلو سامنے لاتے ہیں، وہ اس حقیقت پر شاہد ہیں۔ اور یہ زمین، جو بیج کو پھاڑ کر اس میں سے کونپل کی شکل میں ایک نئی زندگی کی نمود کرتی ہے: (وَالۡاَرۡضِ ذَاتِ الصَّدۡعِ) یہ بھی اس حقیقت پر گواہ ہے کہ

اِنَّہٗ لَقَوۡلٌ فَصۡلٌ (۸۶/۱۲-۱۳)

قرآن ایک فیصلہ کن حقیقت ہے۔ اس میں جو کچھ کہا گیا ہے وہ (DECISIVE) ہے: وَمَا ھُوَ بِالۡھَزۡلِ (۸۶/۱۴)

یونہی مذاق نہیں۔ تم سمجھتے ہو کہ یہ محض "شاعری ہے جسے زمانے کی گردشیں خود بخود مٹا دیں گی"۔ (اَمْ یَقُوْلُوْنَ شَاعِرٌ نَّتَرَبَّصُ بِهٖ رَیْبَ الْمَنُوْنِ (۵۲/۳۰)۔ یہ غلط ہے: فَلَآ اُقْسِمُ بِمَا تُبْصِرُوْنَ۔ وَمَا لَا تُبْصِرُوْنَ وہ تمام حقائق جو تمہاری نگاہوں کے سامنے آ چکے ہیں اور جو تمہاری نگاہوں سے مستور ہیں، وہ سب اس حقیقت پر شاہد ہیں کہ اِنَّهٗ لَقَوْلُ رَسُوْلٍ كَرِیْمٍ۔ وَمَا هُوَ بِقَوْلِ شَاعِرٍ (۶۹/۴۰-۳۹) یہ (قرآن) ایک واجب الاکرام پیمبرؐ کی وساطت سے پہنچنے والے ابدی حقائق کا مجموعہ ہے۔ محض شاعرانہ تخیلات کا نگاہِ فریب مرقع نہیں: وَلَا بِقَوْلِ كَاهِنٍ (۶۹/۴۲) نہ ہی یہ کسی اٹکل پچو باتیں بتانے والے نجومی کی قیاس آرائیاں ہیں۔ بلکہ تَنْزِیْلٌ مِّنْ رَّبِّ الْعٰلَمِیْنَ (۶۹/۴۳)۔ یہ اس خدا کی طرف سے نازل کردہ قوانین کا ضابطہ ہے جو تمام کائنات کا نشوونما دینے والا ہے۔ ہر شے کو آہستہ آہستہ، بتدریج اس کے نقطۂ آغاز سے معراجِ تکمیل تک پہنچانے والا۔ اس قسم کے حقائق نہ کوئی شاعر دے سکتا ہے نہ سر پھرا دیوانہ: وَیَقُوْلُوْنَ اَئِنَّا لَتَارِكُوْٓا اٰلِهَتِنَا لِشَاعِرٍ مَّجْنُوْنٍ۔ (۳۷/۳۶) بَلْ جَآءَ بِالْحَقِّ (۳۷/۳۷)۔ یہ وہی دے سکتا ہے جو خدا کی طرف سے، تعمیری نتائج پیدا کرنے والی مثبت حقیقت لایا ہو: وَمَا عَلَّمْنٰهُ الشِّعْرَ وَمَا یَنْۢبَغِیْ لَهٗ۔ ہم نے اپنے رسول کو شاعری نہیں سکھائی۔ نہ ہی شاعری اس کے شایانِ شان تھی۔ جو زندگی بخش، حیات آور، پیغامِ انقلاب کا حامل ہو، اُسے شاعری سے کیا کام؟ اِنْ هُوَ اِلَّا ذِكْرٌ وَّقُرْاٰنٌ مُّبِیْنٌ۔ یہ ان ابدی حقیقتوں کی یاددہانی ہے جنہیں تم نے فراموش کر رکھا ہے۔ یہ ایک ضابطۂ زندگی ہے جو اپنی بات کو نہایت ابھرے اور نکھرے ہوئے انداز سے تمہارے سامنے پیش کرتا ہے: لِّیُنْذِرَ مَنْ كَانَ حَیًّا وَّیَحِقَّ الْقَوْلُ عَلَى الْكٰفِرِیْنَ (۳۶/۷۰-۶۹) تاکہ ہر اس شخص کو جس میں زندگی کی رمق باقی ہے، غلط روش پر چلنے کے ہلاکت انگیز عواقب سے آگاہ کر دے اور جو لوگ اس کے باوجود اُسی (غلط) روش پر چلتے جائیں وہ اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں کہ جو کچھ اس نے کہا تھا وہ کس طرح حقیقت پر مبنی تھا۔ اس لئے کہ اِنَّهٗ لَقَوْلٌ فَصْلٌ وَّمَا هُوَ بِالْهَزْلِ (۸۶/۱۴-۱۳)۔ یہ فیصلہ کُن بات کرتا ہے۔ یونہی مذاق نہیں کرتا۔ چونکہ تم غور و فکر سے کام نہیں لیتے اس لئے اس کی عظمت کا اندازہ نہیں کر سکتے۔ اس کی عظمت اور اثر انگیزی کا تو یہ عالم ہے کہ لَوْ اَنْزَلْنَا هٰذَا الْقُرْاٰنَ عَلٰى جَبَلٍ لَّرَاَیْتَهٗ خَاشِعًا مُّتَصَدِّعًا مِّنْ خَشْیَةِ اللّٰهِ (۵۹/۲۱)۔ اگر (استعارہ کے طور پر) ہم اسے قلبِ کوہ کے اندر رکھ دیتے (اور اسے احساس عطا کر دیتے تو) تو دیکھتا کہ اس کی خلاف ورزی کے ہلاکت آفریں نتائج کے احساس سے اس کی سختی کس طرح نرم پڑ جاتی اور کس طرح اس کا جگر شق ہو جاتا۔ اس لئے کہ اِنَّهٗ لَقَوْلٌ فَصْلٌ وَّمَا هُوَ بِالْهَزْلِ۔ فَصْلٌ کے معنی ہوتے ہیں الگ الگ کر دینا۔ متمیز کر دینا۔ حق کو باطل سے جدا کر کے دکھا دینا۔ غلط کو صحیح سے الگ کر کے بتا دینا۔ اسی کے لئے دوسری جگہ کہا: حٰمٓ۔ وَالْكِتٰبِ الْمُبِیْنِ: "یہ ایک ایسا ضابطۂ قوانین ہے جو خود بھی واضح اور صاف ہے اور ہر بات کو نہایت وضاحت اور صراحت سے ابھار کر اور نکھار کر بیان کر دیتا ہے"۔ اِنَّآ اَنْزَلْنٰهُ فِیْ لَیْلَةٍ مُّبٰرَكَةٍ اِنَّا كُنَّا مُنْذِرِیْنَ۔ "ہم نے اس کا آغازِ نزول (رمضان کے مہینے کی ایک) ایسی شب میں کیا جو تمام نوعِ انسانی کے لئے نہایت برکت و سعادت کا موجب بن گئی"۔ یہ کتاب ہمارے اس قانون (سُنّت اللہ)

کے مطابق نازل ہوئی جس کی رُو سے ہم شروع سے انسان کو اس کی غلط روش کے تباہ کن نتائج سے آگاہ کرتے چلے آرہے ہیں۔ فِیْهَا یُفْرَقُ كُلُّ اَمْرٍ حَكِیْمٍ (۴۴/۴) "اس میں ان تمام امور کو جو حکمت پر مبنی ہیں (غلط امور سے) الگ کرکے رکھ دیا گیا ہے"۔

قرآن خود روشنی ہے

یہ ہے وہ کتاب جس کا تعارف خود صاحبِ کتاب (خدائے حکیم) نے اس انداز سے کرایا ہے۔ میں نے پہلے کہا ہے کہ قرآن رحمت اس لئے ہے کہ یہ وہ نورِ دشتِ حیات کی راہ نمائی صحیح منزل کی طرف کرتا ہے۔ اس راہ نمائی کے متعلق بھی قرآن کریم نے بڑی وضاحت سے بتایا ہے لیکن میں یہاں (بغرضِ اختصار) سورۂ مائدہ کی دو آیات پیش کرنے پر اکتفا کروں گا۔ ان میں کہا گیا ہے کہ قَدْ جَآءَكُمْ مِّنَ اللّٰهِ نُوْرٌ وَّكِتٰبٌ مُّبِیْنٌ "خدا کی طرف سے تمہارے پاس ایک نور، ایک روشنی آگئی۔ یعنی ایک ایسی کتاب جو بالکل واضح ہے"۔ ظاہر ہے کہ روشنی اپنی دلیل آپ ہوتی ہے۔ اسے تلاش کرنے یا دیکھنے کے لئے کسی اور روشنی کی ضرورت نہیں ہوتی۔ اگر کسی کمرے میں بجلی کا قمقمہ روشن ہو تو آپ وہاں دیا جلا کر نہیں لے جاتے کہ دیکھیں بجلی کا قمقمہ کہاں ہے اور کیسا ہے! یہ مفہوم ہے ایسا کہنے کا کہ روشنی اپنی دلیل آپ ہوتی ہے۔ اسے دیکھنے کے لئے کسی اور روشنی کی ضرورت نہیں ہوتی، اس سے فائدہ اٹھانے کے لئے البتہ انسانی آنکھ کی ضرورت ہوتی ہے۔ روشنی اُسے ہی فائدہ دے سکتی ہے جو اپنی آنکھیں کھلی رکھے۔ جو آنکھیں بند رکھے، اس کے لئے روشنی کا عدم اور وجود برابر ہوتا ہے۔ قرآن کے سراجِ منیر سے مستفید ہونے کے لئے انسانی عقل و فکر کی آنکھ کا کھلا رہنا ضروری ہے۔ جو لوگ عقل و فکر سے کام نہیں لیتے، انہیں یہ جگمگاتا چراغ بھی کچھ فائدہ نہیں پہنچا سکتا۔

یہ ہے وہ مشعل، وہ سراجِ منیر، وہ جگمگاتا چراغ جو سفرِ زندگی میں راہ نمائی کا کام دیتا ہے۔ یہ چراغ کرتا کیا ہے! یَهْدِیْ بِهِ اللّٰهُ مَنِ اتَّبَعَ رِضْوَانَهٗ سُبُلَ السَّلٰمِ (۵/۱۶) "یہ سلامتی کے راستوں کی طرف راہ نمائی کرتا ہے"۔ سلام، بڑا جامع لفظ ہے۔ عام طور پر یہ لفظ "خطرات سے محفوظ رہنے" کے لئے بولا جاتا ہے۔ لیکن اس کا مفہوم اتنا ہی نہیں، اس سے زیادہ وسیع ہے۔ اس کا مفہوم ہوتا ہے کسی کو خطرات سے محفوظ رکھ کر اسے تکمیل کی منزل تک پہنچا دینا۔ یہ کاروانِ انسانیت کی خطرات سے حفاظت کس طرح کرتا ہے؟ یُخْرِجُهُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ —— یہ انہیں، زندگی کی ہولناک تاریکیوں سے نکال کر روشنی کی طرف لے آتا ہے اور اس طرح یَهْدِیْهِمْ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ (۵/۱۶) ان کی راہنمائی زندگی کے سیدھے، توازن بدوش راستے کی طرف کر دیتا ہے۔ یہاں صراطِ مستقیم کہا ہے۔ دوسری جگہ ہے: اِنَّ هٰذَا الْقُرْاٰنَ یَهْدِیْ لِلَّتِیْ هِیَ اَقْوَمُ (۱۷/۹)۔ یقیناً یہ قرآن، نوعِ انسان کی راہ نمائی اس راستے کی طرف کرتا ہے جو اقوم ہے —— سب سے زیادہ متوازن راہ۔ اور یہ تو آپ کو معلوم ہی ہے کہ زندگی کے قیام کا دارومدار توازن پر ہے۔ جس کا توازن بگڑ جائے، چلنا تو ایک طرف، وہ اپنے پاؤں پر کھڑا بھی نہیں رہ سکتا —— ہماری زبوں حالی اور خستہ حال نصیبی کی بنیادی وجہ یہی ہے کہ ہمارے معاشرہ کا توازن بگڑ چکا ہے۔ نہ ہماری انفرادی زندگی متوازن (BALANCED) رہی ہے نہ معاشرہ متوازن۔ قرآن، افراد اور اقوام

بلکہ نوعِ انسان کا بگڑا ہوا تواز ن درست کر دیتا اور اس طرح انہیں چلنے کے قابل بنا دیتا ہے۔ اس مقام پر ضمناً اتنا اور سمجھ لیجئے کہ قرآن صحیح راستے کی طرف راہ نمائی کرتا ہے۔ وہ یہ بتاتا ہے کہ صحیح راستہ کونسا ہے۔ کسی کو اُٹھا کر خود منزل تک نہیں پہنچا دیتا۔ منزل تک پہنچنے کے لئے چلنا، مسافر کو خود ہی پڑتا ہے۔ ایمان کے ساتھ اعمالِ صالح کی شرط سے یہی مراد ہے۔ ایمان ہوتا ہے راستے کے صحیح ہونے پر یقین محکم، اور عمل صالح کے معنی ہوتے ہیں اس راستے پر چلتے جانا۔ جو مسافر راستے کی صحت پر یقین کے دعوے کے باوجود، بیٹھا رہتا ہے، چلتا نہیں، راستے کی صحت اسے بھی کچھ فائدہ نہیں دے سکتی۔

ہم نے دیکھا ہے کہ قرآن زندگی کی راہوں کو روشن کر دیتا ہے۔ اس سے یہ سوال سامنے آتا ہے کہ وہ کون سے راہزن ہیں جو اس راستے میں روک بن کر کھڑے ہو جاتے ہیں اور کاروانِ انسانیت کو غلط راہوں پر ڈال دیتے ہیں۔ اس سوال اور اس کے جواب کا سمجھ لینا نہایت ضروری ہے۔ کیونکہ اس کے بغیر ہم صحیح راستے کی طرف قدم ہی نہیں اٹھا سکتے۔ لیکن اسے سمجھنے کے لئے، یہ سمجھ لینا بھی ضروری ہے کہ قرآن کا پیغام کیا ہے، اور یہ راہزن اس کی مخالفت کیوں کرتے ہیں۔

جہاں تک قرآن کی تعلیم کا تعلق ہے اس کا ملخص اقبالؒ نے ایک مصرعہ میں ایسے حسن کارانہ ایجاز سے سمو کر رکھ دیا ہے جس پر کسی اضافہ کی ضرورت نہیں۔ انہوں نے کہا ہے کہ قرآن!

موت کا پیغام ہر نوعِ غلامی کے لئے

اب یہ ظاہر ہے کہ جب یہ ہر نوعِ غلامی کے لئے موت کا پیغام ہے، جو مستبد قوتیں دوسرے انسانوں کو اپنی محکومی اور محتاجی کے مرئی اور غیر مرئی شکنجوں میں کس کر رکھتی تھیں، وہ اس کی آواز کو کس طرح برداشت کر سکتی تھیں۔ یہ تھیں وہ قوتیں جو اس دعوتِ خداوندی کی مخالفت میں اپنا پورا زور صرف کر دیتی تھیں۔ واضح رہے کہ یہ پیغامِ خداوندی قرآن کے ذریعے پہلی بار انسانیت تک نہیں پہنچایا گیا۔ جب سے آسمان سلسلہ رشد و ہدایت شروع ہوا، ہر رسول کے ذریعے یہی پیغام دیا گیا۔ اور اسی بنا پر رسول کی قوم نے اس کی مخالفت کی۔ اس سلسلۂ انبیاء کرامؑ کی آخری کڑی حضور نبی اکرمؐ کی ذاتِ گرامی تھی۔ چونکہ حضورؐ کے بعد وحی کا سلسلہ ختم کر دیا گیا تھا اس لئے یہ پیغامِ خداوندی اپنی آخری اور مکمل شکل میں محفوظ کر دیا گیا۔

سلسلۂ انبیاء کرامؑ تو حضورؐ کی ذاتِ اقدس پر ختم ہو گیا، لیکن دعوتِ انبیاء کرامؑ کا سلسلہ ختم نہیں ہوا۔ اس دعوت کے پیش کرنے کے لئے خدا کی طرف سے اب کسی رسول کے آنے کی ضرورت نہیں۔ یہ فریضہ امتِ محمدیہؐ کے سپرد کر دیا گیا جب کہا کہ ثُمَّ اَوْرَثْنَا الْكِتٰبَ الَّذِيْنَ اصْطَفَيْنَا مِنْ عِبَادِنَا (۳۵/۳۲)۔ "پھر ہم نے اس کتاب کا وارث ان لوگوں کو بنا دیا جنہیں اس مقصد کے لئے منتخب کیا گیا تھا"۔ اب اطاعت خداوندی کی دعوت کا فریضہ امتِ محمدیہؐ کو سونپ دیا گیا ہے۔

یہ ظاہر ہے کہ جب وہ دعوت موجود ہو گی تو اس کی مخالفت کرنے والے عناصر بھی موجود ہوں گے، کہ کشمکشِ حق و باطل ازل سے چلی آ رہی ہے اور ابد تک رہے گی۔ اس تیرہ سو سال میں یہ دعوت کس طرح

پیش کی گئی اور اس کی مخالفت کس کس انداز سے ہوئی، اس تفصیل سے صرفِ نظر کر کے، مجھے دورِ حاضر کی طرف آجانا چاہیئے۔ اگر کوئی مجھ سے پوچھے کہ مملکتِ پاکستان کے مطالبہ کا تقاضا، مقصود اور منتہیٰ کیا تھا تو میں ایک فقرہ میں کہہ دوں گا کہ اس کا مقصود یہ تھا کہ ایک ایسا خطۂ زمین وجود میں آجائے جہاں انسان، انسانوں کی محکومی سے نجات حاصل کر کے، خالصتہً قوانینِ خداوندی کی اطاعت اختیار کرنے کے قابل ہو سکے۔ یعنی ایسی مملکت جس میں حکومت صرف خدا کی کتاب کی ہو۔ پاکستان کا تصور دینے والے اقبالؒ نے اپنے عمر بھر کے فکر و تدبر کے بعد، اس حقیقت کو پالیا تھا کہ ہماری، ذلتوں اور ناکامیوں کا بنیادی سبب یہ ہے کہ ہم نے خدا کی کتاب سے اعراض برت رکھا ہے۔ اسی لئے اس نے مسلمانوں سے کہا تھا کہ ؎

خوار از مہجوریِ قرآن شدی　　شکوہ سنجِ گردشِ دوراں شدی

تم خواہ مخواہ زمانے کی گردشوں اور حالات کی نامساعدتوں کا شکوہ کرتے پھر رہے ہو۔ تمہاری ذلت و خواری کا حقیقی سبب یہ ہے کہ تم نے قرآن کو چھوڑ رکھا ہے۔ لہٰذا :۔ ؎

گر تو می خواہی مسلمان زیستن　　نیست ممکن جز بقرآن زیستن

اقبالؒ کے تتبع میں، یہی آواز قائداعظمؒ بھی بلند کرتے رہے۔ اقبالؒ، پاکستان کے وجود میں آنے سے پہلے ہی دنیا سے رخصت ہو گئے اور قائداعظمؒ اس کے فوری بعد ہم سے جدا ہو گئے۔ میں قرآن کریم کا طالبعلم ہوں اس لئے یہ فریضہ میں نے اپنے ذمے لیا کہ اس دعوت کو عام کروں کہ اسلامی مملکتِ پاکستان میں اطاعت و محکومیت صرف کتاب اللہ کی ہوگی۔

میری قرآنی دعوت

اقتدار اسی کو حاصل ہوگا، اور کسی کو نہیں۔ ادھر سے یہ دعوت پیش ہوئی اور جیسا کہ ہوتا چلا آرہا تھا۔ اس کے مخالفین ہجوم کر کے اٹھ کھڑے ہوئے۔ مملکتِ پاکستان کی ساری تاریخ اسی کشمکش کی عبرت آموز داستان ہے۔ جیسا کہ قرآن کریم ہمیں بتاتا ہے کہ حق کے مخالفین نے کبھی یہ نہیں کیا کہ کسی داعی الی الحق سے یہ کہا ہو کہ آؤ! ہم تمہاری بات کو علم و بصیرت کی کسوٹی پر پرکھ کر دیکھتے ہیں۔ اگر یہ معیارِ حق و صداقت پر پوری اتری تو اسے اختیار کر لیا جائے گا۔ اور اگر یہ صحیح ثابت نہ ہوئی تو اسے مسترد کر دیا جائے گا۔ انہوں نے کبھی ایسا نہیں کیا، اس لئے کہ وہ جانتے ہیں کہ علم و بصیرت کی بارگاہ سے کبھی ان کے حق میں فیصلہ نہیں ہوگا۔ انہوں نے ہمیشہ یہ وطیرہ اختیار کیا ہے کہ اس داعی کے خلاف طرح طرح کی الزام تراشیوں سے عوام کے جذبات کو مشتعل کر دیا۔ جب حضور نبی اکرمؐ نے اپنی دعوت کو پیش کیا تو مخالفین نے جو جو حربے استعمال کئے، قرآن اسے تفصیل سے بیان کرتا ہے۔ آپؐ کو مفتری کہا گیا، کذاب کہا گیا۔ پاگل (مجنوں) کہا گیا۔ مسحور کہا گیا۔ کاہن کہا گیا۔ شاعر کہا گیا۔ آپؐ کا ہر طرح سے مذاق اڑایا گیا۔ استہزا کیا گیا۔ غرضیکہ کوئی الزام ایسا نہیں تھا جسے حضورؐ کے خلاف تراشا نہ گیا ہو، اور کوئی حربہ ایسا نہیں تھا جسے استعمال نہ کیا گیا ہو۔ حضورؐ جس جگہ یہ آواز بلند کرتے، یہ لوگ ہجوم کر کے آجاتے اور عوام سے کہتے کہ لَا تَسْمَعُوْا لِهٰذَا الْقُرْاٰنِ وَالْغَوْا فِيْهِ لَعَلَّكُمْ تَغْلِبُوْنَ (۴۱/۲۶) "تم اس قرآن کو نہ خود سنو، نہ دوسروں کو سننے دو۔ جہاں اسے پیش کیا جائے، خوب شور مچاؤ، تاکہ لوگ اسے سن ہی نہ سکیں"۔ یہی ایک طریق

ہے جس سے تم اس آواز کو دبا سکتے ہو"۔ اگر لوگوں نے اُسے سُن لیا تو پھر یہ اپنا اثر کئے بغیر نہیں رہے گی۔

میرے خلاف الزامات

عزیزانِ من! مجھے حضور نبی اکرمؐ کی ذاتِ اقدس و اعظمؐ سے کیا نسبت؟ لیکن چونکہ، سُنتِ رسول اللہؐ کے اتباع میں مَیں بھی وہی کہتا ہوں جسے حضورؐ پیش فرماتے تھے، یعنی اِتَّبِعُوْا مَآ اُنْزِلَ اِلَیْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَلَا تَتَّبِعُوْا مِنْ دُوْنِهٖۤ اَوْلِیَآءَ (۷/۳)۔ "اتباع صرف کتابِ خداوندی کا کرو، اس کے سوا کسی کا اتباع نہ کرو"۔ اس لئے اس دعوت کی مخالفت میں حربے بھی وہی استعمال کئے گئے۔ یعنی الزام تراشیاں اور اشتعال انگیزیاں ——— یہ مدعی نبوت ہونے کی تیاریاں کر رہا ہے۔ ایک نیا مذہب ایجاد کرنا چاہتا ہے۔ تین نمازیں اور ۹ دن کے روزے بتاتا ہے۔ کہتا ہے اُردو میں نماز پڑھا کرو۔ یہ اور اسی قسم کے اور سینکڑوں بے بنیاد الزامات اور لوگوں سے تاکید کہ اس کے پاس کبھی نہ بیٹھو۔ اس کے درس میں کبھی نہ جاؤ۔ اس کی کتابوں کو ہاتھ نہ لگاؤ۔ انہیں چھوؤ تک نہیں ورنہ تمہارا ایمان جاتا رہے گا۔ تم بھی اسی کی طرح گمراہ اور بے دین ہو جاؤ گے، یعنی وہی پُرانا حربہ کہ لَا تَسْمَعُوْا لِهٰذَا الْقُرْاٰنِ وَالْغَوْا فِیْهِ (۴۱/۲۶)۔ "قرآن کی آواز مت سنو، خود بھی نہ سنو اور شور مچاتے رہو تاکہ دوسرے بھی اسے سُننے نہ پائیں۔

مَیں مایوس نہیں

میں جانتا ہوں کہ اس مقام پہ آپ مجھ سے یہ سوال کریں گے کہ تم نے شروع میں کہا تھا کہ میں مایوس نہیں، لیکن حالات کے تجزیہ کے بعد جو نتیجہ سامنے آتا ہے وہ پہلے سے بھی زیادہ مایوس کن ہے۔ پھر تم مایوس کس طرح نہیں ہو؟ حالات یقیناً ایسے ہی ہیں، لیکن اس کے باوجود عزیزانِ من! قرآن کے طالب علم کے لئے مایوسی کی کوئی بات نہیں! شامِ صحرا کی سی ہولناک خاموشیوں اور عمیق بحر کی سی روح فرسا تاریکیوں میں یہ نشید جانفزا ہمیشہ اس کے لئے فردوسِ گوش بنتی رہتی ہے کہ یٰعِبَادِیَ الَّذِیْنَ اَسْرَفُوْا عَلٰۤى اَنْفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ۔ اے میرے بندو جو اپنے آپ پر زیادتیاں کر چکے ہو، اللہ کی رحمت سے مایوس مت ہو۔ خدا تمہاری کوتاہیوں اور لغزشوں کے پیدا کردہ خطرات سے تمہاری حفاظت کا سامان پیدا کر دے گا: اِنَّهٗ هُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِیْمُ۔ وہ سامانِ حفاظت بھی عطا کر دے گا اور اسبابِ رحمت بھی۔ اس کے لئے کرنے کا کام یہ ہے: وَاَنِیْبُوْۤا اِلٰى رَبِّكُمْ وَاَسْلِمُوْا لَهٗ مِنْ قَبْلِ اَنْ یَّاْتِیَكُمُ الْعَذَابُ ثُمَّ لَا تُنْصَرُوْنَ۔ "تم اپنے نشوونما دینے والے کی طرف لوٹ کر آجاؤ قبل اس کے کہ آخری تباہی تمہیں آن گھیرے۔ اس صورت میں کوئی بھی تمہاری مدد نہیں کر سکے گا"۔ اور اس کا عملی طریقہ یہ کہ وَاتَّبِعُوْۤا اَحْسَنَ مَاۤ اُنْزِلَ اِلَیْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ مِّنْ قَبْلِ اَنْ یَّاْتِیَكُمُ الْعَذَابُ بَغْتَةً وَّاَنْتُمْ لَا تَشْعُرُوْنَ ($\frac{۳۹}{۵۵-۵۳}$) "جو کچھ خدا نے تمہاری طرف نازل کیا ہے، اس کی بطریقِ احسن پیروی کرو، قبل اس کے کہ آخری تباہی تمہیں اس طرح آ پکڑے کہ تمہیں پتہ ہی نہ چلے کہ یہ کہاں سے آ گئی اور کیسے آ گئی"۔

قرآن نے یہ امید دل بھرا پیغام، آج سے چودہ سو سال پہلے خطۂ عرب میں بسنے والی قوم ہی کو نہیں

دیا تھا - اس کا یہ پیغام آج بھی اُسی طرح زندہ و پائندہ ہے اور دنیا کی ہر اس قوم کے لئے حفاظت اور زندگی کی ضمانت کا مدعیٔ جس نے اپنے آپ پر زیادتی کر لی ہو - اس قسم کے پیغام کی موجودگی میں مایوسی کا کیا سوال! مایوس تو وہ ہو جو یہ سمجھے کہ اب اس پیغام میں اس کی صلاحیت نہیں رہی کہ یہ کسی قوم کو از سرِ نو زندگی عطا کر سکے - اس نے جب (بزبانِ حضرت یعقوبؑ کہا تھا کہ) اِنَّهٗ لَا یَایْـَٔسُ مِنْ رَّوْحِ اللّٰهِ اِلَّا الْقَوْمُ الْكٰفِرُوْنَ (۱۲/۸۷) تو اس سے یہی مقصود تھا - ہم مایوس اس لئے ہو جاتے ہیں کہ

(۱) یا تو ہمیں قرآن کی ابدی صداقتوں پر یقین نہیں رہتا - یا

(۲) ہم کامیابی اور ناکامی کو کسی خاص خطۂ زمین تک محدود، یا خاص قوم سے وابستہ کر دیتے ہیں۔

اور یا

(۳) ہم چاہتے ہیں کہ ہماری کوششوں کا نتیجہ ہماری زندگی ہی میں محسوس شکل میں سامنے آ جائے -

شقِ اوّل کے سلسلہ میں واضح ہے کہ میرے لئے قرآن کی ابدیت کے متعلق کسی قسم کے شک و شبہ کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا - میری تو زندگی اسی یقین کے سہارے قائم ہے - لہٰذا، میں باقی دو شقوں کے متعلق ہی بات کروں گا -

قرآن کا پیغام جس طرح کسی خاص زمانے تک محدود نہیں، اسی طرح وہ کسی خاص خطۂ زمین میں بھی مقید، یا کسی خاص قوم تک محصور نہیں - وہ ذکر للعالمین ہے - تمام نوعِ انسان کے لئے، ہمیشہ کے لئے پیغامِ حیات —— میں یہ دیکھ رہا ہوں کہ بیشتر اقوامِ عالم، قرآنی پیغام کے قریب آ رہی ہیں - قرآن نے اِلّا کی منزل تک پہنچنے کے لئے لَا کو مقدم شرط قرار دیا ہے - لَا کے معنی ہیں تمام غیر قرآنی تصورات و نظریات سے چھٹکارا حاصل کر لینا - دنیا کی کم و بیش تمام مہذب قومیں قدامت پرستی کی اندھی تقلید سے نجات حاصل کر چکی ہیں، لیکن چونکہ ان کے سامنے زندگی کی کوئی مثبت اقدار نہیں اس لئے وہ لَا کے بحران سے آگے نہیں بڑھ سکیں - کچھ عرصہ تک تو وہ اس نجات کے جشن منانے میں مگن رہیں لیکن اس کے بعد انہوں نے محسوس کرنا شروع کر دیا ہے کہ زندگی خلا میں نہیں گزاری جا سکتی - اس وقت اقوامِ مغرب کا عالمگیر اضطراب اسی شدتِ احساس کا دیوانہ وار مظاہرہ ہے - انہیں زندگی کی مثبت بنیادوں کی تلاش ہے اور وہ قرآن کے سوا کہیں نہیں مل سکتیں - میں یہ محض بر بنائے عقیدت نہیں کہہ رہا - علیٰ وجہ البصیرت کہہ رہا ہوں - اس نتیجہ پر میں، اقوامِ مغرب کے افکار کے مطالعہ ہی سے نہیں پہنچا، وہاں کے مفکرین اور ریسرچ سکالرز جو مجھے ملنے آتے ہیں، ان سے بالمشافہ گفتگو کے بعد اس نتیجہ پر پہنچا ہوں - اس لئے میں قرآن کی ابدی صداقت یا نوعِ انسان کے مستقبل کی طرف سے کس طرح مایوس ہو سکتا ہوں؟ باقی رہا خطۂ زمین کا سوال، سو اس میں شبہ نہیں کہ جس سرزمین میں انسان پیدا ہوتا ہے' جی چاہتا ہے کہ وہ سرزمین سب سے پہلے قرآنی روشنی سے منور ہو —— ہر رسول نے اپنی تبلیغ کا آغاز اپنی زادبوم ہی سے کیا تھا - میری بھی یہ آرزو ہے کہ یہ خطۂ زمین' جسے ہم نے حاصل ہی اس مقصد کے لئے کیا تھا، سب سے پہلے قرآنی اقدار کا گہوارہ بنے - لیکن اگر ہم اس خوش بختی کے لئے آمادہ نہیں تو یہ آفتاب کسی اور سرزمین پر طلوع ہو جائے گا -

لہٰذا اس میں مایوسی کی کون سی بات ہے۔

اگر کھو گیا اِک نشیمن تو کیا غم مقاماتِ آہ و فغاں اور بھی ہیں

جہاں تک خود سرزمینِ پاکستان کا تعلق ہے، میں تو یہاں بھی کچھ مشکل نہیں دیکھ رہا۔ جیسا کہ میں شروع سے کہتا چلا آ رہا ہوں، اس کا آسان طریقہ یہ ہے کہ ہم اپنی نئی نسل کی تعلیم کا ایسا انتظام کریں کہ قرآنِ کریم کی راہ نمائی ان کے قلب کی گہرائیوں میں پیوست ہو جائے۔ نظامِ تعلیم میں اس تبدیلی کے لئے ہمیں پوری پوری آزادی حاصل ہے۔ اس میں ہم کسی طرح بھی مجبور نہیں۔ اور جب ہم اس باب میں مجبور نہیں تو ہم مایوس کیوں ہوں؟ قرآنِ کریم نے اپنے پیغام کے اوّلیں صفحات پر ابلیس و آدم کی داستان تمثیلی طور پر بیان کی ہے۔ اس داستان کی رُو سے ہے کہ آدم کو اپنی غلطی کا احساس ہوا تو اس نے اس کا اعتراف کیا کہ مجھ سے غلطی ہوئی۔ میں اس کا ذمہ دار ہوں۔ آئندہ محتاط رہوں گا۔ اُس پر بازِ آفرینی کے دروازے کھل گئے۔ ابلیس سے پوچھا گیا کہ تو نے ایسا کیوں کیا تو اس نے کہا کہ میں مجبور ہوں، صاحبِ اختیار نہیں۔ اس لئے میں اپنی غلطی کا ذمہ دار نہیں۔ اس سے کہا گیا کہ تو اپنے آپ کو مجبور سمجھتا ہے تو تجھ پر زندگی کے راستے کشادہ نہیں ہو سکتے۔ ابدی مایوسی تیرا مقدر ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ مایوس وہ ہوتا ہے جو اپنے آپ کو مجبور سمجھنے لگ جائے۔

پاکستان کا مستقبل

لہٰذا، عزیزانِ من! میں خطۂ پاکستان کے مستقبل کی طرف سے بھی مایوس نہیں۔ میں تو سمجھتا ہوں کہ یہ جو ہمارے حالات اس درجہ پریشان کن ہو گئے ہیں تو یہ بھی ہمارے حق میں بہتری ہے۔ اگر ابتری اتنی شدّت اختیار نہ کر لیتی تو ہمیں اپنی غلطیوں کا احساس ہی نہ ہوتا۔ درد کی شدّت اپنے مرض کی طرف سے غافل بیمار کو علاج کے لئے مجبور کر دیا کرتی ہے۔

اس کے بعد تیسری شق کو لیجئے تو انسان کی یہ فطری خواہش ہوتی ہے کہ وہ اپنی آرزوؤں کے منتہیٰ کو اپنی آنکھوں سے دیکھ لے۔ جسے اپنی زندگی میں اپنی کوششیں ثمر بار ہوتی دکھائی نہ دیں، وہ مایوس ہو جاتا ہے۔ لیکن قرآنِ کریم تسلسلِ حیات کے عقیدہ سے اس قسم کی مایوسی کو بھی انسان کے پاس پھٹکنے نہیں دیتا۔ اسی قسم کی آرزو حضور نبی اکرمؐ کے سینۂ اطہر میں بھی ابھری تھی جب آپ نے (بزبانِ حال) کہا تھا کہ بارِ الٰہا! میری ساری زندگی اسی تگ و تاز میں گذر جائے گی، یا میں اپنی کوششوں کو ثمر بار ہوتے بھی دیکھ لوں گا۔ تو اس کا جواب ملا تھا کہ وَاِنْ مَّا نُرِيَنَّكَ بَعْضَ الَّذِيْ نَعِدُهُمْ اَوْ نَتَوَفَّيَنَّكَ تمہیں اس سے غرض نہیں ہونی چاہیئے کہ تمہاری کوششوں کا نتیجہ تمہاری زندگی میں سامنے آجائے گا۔ یا اس کے بعد فَاِنَّمَا عَلَيْكَ الْبَلٰغُ وَعَلَيْنَا الْحِسَابُ (۱۳/۴۰)۔ تیرا کام یہ ہے کہ تو اس پیغام کو عام کرتا جائے۔ اس کا حساب لگانا ہمارے ذمے ہے کہ یہ تخم ریزی بار آور کب ہو گی۔ تمہیں اس باب میں متردّد نہیں ہونا چاہیئے، نہ ہی مایوس۔ مایوس وہ ہو جو سمجھے کہ موت سے اس کی زندگی کا خاتمہ ہو جائے گا۔ جسے تسلسلِ حیات پر ایمان ہو، وہ مایوس کیوں ہو۔ اقبالؒ کے الفاظ میں:-

قناعت نہ کر عالمِ رنگ و بو پر چمن اور بھی آشیاں اور بھی ہیں

اسی روز و شب میں اُلجھ کر نہ رہ جا کہ تیرے زمان و مکان اور بھی ہیں

لہٰذا، قرآن کا طالبعلم نہ اپنی ذات سے مایوس ہوتا ہے نہ انسانیت کے مستقبل کی طرف سے مایوس۔ اور یہی ہے وہ نشید جانفزا جسے قرآن بار بار ہمارے قلوب تک پہنچاتا ہے اور (جیسا کہ میں نے آغازِ درس میں بتایا ہے) جسے دہرانے کے لئے، خود خدائے کائنات اس کے نزول پر جشنِ مسرت منانے کا حکم دیتا ہے جب کہتا ہے کہ قُلْ بِفَضْلِ اللّٰهِ وَبِرَحْمَتِهٖ فَبِذٰلِكَ فَلْيَفْرَحُوْا ۭ هُوَ خَيْرٌ مِّمَّا يَجْمَعُوْنَ (۱۰/۵۸) "یہ محض اللہ کا فضل و رحمت ہے کہ تمہیں قرآن جیسی متاعِ گراں بہا مل گئی ہے۔ سو اس عطیہ کے ملنے پر جشنِ مسرت مناؤ"۔ اور یہی ہے وہ جشنِ مسرت جس میں آپ کی خدمت میں یہ کہتا ہوا ہدیۂ مبارکباد پیش کرتا ہوں کہ ؎

نہ ہو نومید، نومیدی زوالِ علم و عرفاں ہے امیدِ مردِ مومن ہے خدا کے رازدانوں میں

عید جشنِ نزولِ قرآن کا دوسرا نام ہے۔ اور قرآن کا پیغام یہ ہے کہ تم جب بھی میرے بتائے ہوئے راستے پر چلنے کے لئے اٹھ کھڑے ہو، تمہاری راہیں روشن ہوتی چلی جائیں گی۔ قرآن کے اس پیغام کو میں ہر سال قوم کے سامنے بطور ہدیۂ تبریکِ عید پیش کئے چلا آرہا ہوں

والسلام

انسان نے کیا سوچا؟

کیا تنہا عقلِ انسانی، زندگی کے مسائل کا حل دریافت کر سکتی ہے؟ اس اہم اور پیچیدہ سوال کا جواب یونان کے فلاسفروں سے لے کر ہمارے زمانے تک کے مفکرین، مورخین اور سائنس دانوں نے کیا دیا ہے۔ اس کتاب سے یہ حقیقت بھی سامنے آجائے گی کہ عقلِ انسانی کو وحی کی روشنی کی ضرورت کیوں ہے؟

یہ کتاب آپ کو سینکڑوں کتابوں کے مطالعہ سے بے نیاز کر دے گی۔ کتاب نہایت خوبصورت ٹائپ میں سفید کاغذ پر چھاپی گئی ہے۔ قیمت۔ مجلد -/۳۴ روپے

کتاب التقدیر

انسان کی قسمت، خدا کی مشیت اور غریب کی تقدیر سے کیا مفہوم ہے؟ کیا موت کا دن مقرر ہے؟ بعض بچے پیدائشی اپاہج کیوں پیدا ہوتے ہیں؟ دعا کیا ہے اور کیا اس سے تقدیر بدل جاتی ہے؟ اس قسم کے بیشمار سوالات، ان کا جائزہ اور قرآن کریم کی روشنی میں ان کا حل آپ کو اس کتاب میں ملے گا۔ کتاب بڑے سائز کے چار سو سے زائد صفحات پر مشتمل ہے اور عمدہ سفید کاغذ پر چھاپی گئی ہے۔

جلد مضبوط (نقشِ ثانی)

قیمت -/۳۰ روپے

نوٹ:- ان قیمتوں میں محصول ڈاک شامل نہیں

ملنے کا پتہ (۱) مکتبۂ دین و دانش اردو بازار لاہور (۲) ادارہ طلوعِ اسلام - ۲۵/بی - گلبرگ ۲ لاہور

مصنف کی دیگر شہرۂ آفاق کتابیں جن سے صحیح اسلام سمجھ میں آسکتا ہے

لغات القرآن

یہ قرآنی الفاظ کی صرف ڈکشنری نہیں، یہ ان کا مستند اور واضح مفہوم پیش کرنے کے ساتھ ساتھ یہ بھی بتاتی ہے کہ ان الفاظ سے قرآن کریم کس قسم کا تصور پیش کرتا ہے، اس کی تعلیم کیا ہے، اس کی دعوت کیا ہے۔ قرآن مجید نے انسان کو کیا دیا ہے۔ یہ اس کا کیا مقام متعین کرتا ہے چار جلدوں کی یہ کتاب قرآنی حقائق اور علومِ حاضرہ کا انسائیکلوپیڈیا ہے۔ خوبصورت ٹائپ میں عمدہ سفید کاغذ پر چھپی ہے۔ قیمت:- فی جلد -/۳۰ روپے
مکمل سیٹ -/۱۲۰ روپے

تبویب القرآن

آپ کے ذہن میں کوئی سوال آئے اور آپ معلوم کرنا چاہیں کہ اس کی بابت قرآن مجید میں کیا اور کہاں کہاں آیا ہے، تو اس کتاب سے آپ کو یہ معلوم ہو جائے گا۔

اس کتاب میں قریب دو ہزار چار سو عنوانات ہیں اور ہر عنوان کے تحت اُن قرآنی آیات کا حوالہ دیا گیا ہے جن میں اس کے متعلق بالواسطہ یا بلاواسطہ کچھ کہا گیا ہے۔ مصنف کی چالیس سالہ محنتِ شاقہ کا ماحصل ہے۔ کتاب بڑے سائز کے ۵۱۲ صفحات پر مشتمل ہے عمدہ سفید کاغذ، اوفسٹ کی چھپائی۔ تین مضبوط اور دیدہ زیب جلدوں میں۔ قیمت:- مکمل سیٹ -/۱۶۰ روپے

مفہوم القرآن

قرآن مجید مروجہ ترجموں اور عام تفسیروں سے سمجھ میں نہیں آسکتا، یہ اس طرح سمجھ میں آسکتا ہے کہ عربی مبین کی مستند کتب لغت کی رُو سے اس کے الفاظ کے معانی متعین کئے جائیں اور ایک مضمون سے متعلق مختلف آیات کو سامنے رکھ کر اس کا مفہوم مرتب کیا جائے۔ مفکرِ قرآن پرویز صاحب نے پورے قرآن کا مفہوم اسی انداز سے مرتب کیا ہے جو مفہوم القرآن کے نام سے (مع متن) عمدہ دبیز کاغذ پر تین مطلا جلدوں میں شائع ہو چکا ہے۔ قیمت:- فی جلد -/۴۰ روپے
مکمل سیٹ مجلد -/۱۲۰ روپے

مطالب الفرقان

پرویز صاحب کے درسِ قرآن مجید کا سلسلہ گزشتہ بیس سال سے جاری ہے۔ اس میں ان کا انداز یہ ہوتا ہے کہ نزولِ قرآن کے وقت کے محاورۂ عرب اور تصریف آیاتِ قرآنی سے آیاتِ قرآنی کی جدید دور کے تقاضوں کے مطابق مسلسل تشریح کرتے چلے جاتے ہیں۔ انہوں نے اپنے ان درسوں کی بنیاد پر قرآن کریم کی تفسیر مرتب کرنے کا سلسلہ شروع کر دیا ہے جس کا نام مطالب الفرقان ہے ابھی تک اس کی دو جلدیں شائع ہوئی ہیں۔
عمدہ سفید کاغذ، پاکیزہ اوفسٹ چھپائی۔
قیمت:- جلد اوّل -/۴۰ روپے جلد دوم -/۵۰ روپے جلد سوم -/۵۰ روپے

ملنے کا پتہ

(۱) ادارۂ طلوعِ اسلام بی/۲۵ گلبرگ ۲ لاہور ۱۰ (۲) مکتبہ دین و دانش چوک اردو بازار لاہور

فہرست معطیان قرآنک ایجوکیشن سوسائٹی

(۱۷ جون تا ۱۴ جولائی ۱۹۸۰ء)

اسمائے گرامی	رقم	رسید نمبر
محترم		
۱- کرنل ایس اے قدیر صاحب معرفت بزم طلوع اسلام۔ لاہور چھاؤنی	۵۰۰۰/- روپے	۳۳۰۷
۲- نام کی اشاعت نہیں چاہتے	۳۰/-	۳۳۰۸
۳- مس آر۔ خان صاحبہ۔ بحرین	۳۲۵/-	۳۳۰۹
۴- توکل میڈیکل سٹور۔ کراچی معرفت بزم طلوع اسلام کراچی	۵۰۰/-	۳۳۱۰
۵- عبدالنعیم حافظ صاحب 〃 〃 〃 〃 〃	۲۰۰/-	۳۳۱۱
۶- مسز نزہت ملک صاحبہ 〃 〃 〃 〃 〃	۳۰/-	۳۳۱۲
۷- بیگم علی اصغر صاحبہ 〃 〃 〃 〃 〃	۱۰۰/-	۳۳۱۳
۸- علی اصغر صاحب 〃 〃 〃 〃 〃	۱۰۰/-	۳۳۱۴
۹- حیات الٰہی رضوی صاحب 〃 〃 〃 〃 〃	۲۰۰/-	۳۳۱۵
۱۰- حاجی احمد صاحب 〃 〃 〃 〃 〃	۱۰۰۰/-	۳۳۱۶
۱۱- مسز شجاع صاحبہ۔ اسلام آباد معرفت مسز ظفر سعید صاحبہ	۱۰۰/-	۳۳۱۷
۱۲- منیر احمد صاحب۔ سمن آباد۔ لاہور	۵۰/-	۳۳۱۸
۱۳- سلمان احمد صاحب۔ 〃 〃	۵۰/-	۳۳۱۹
۱۴- عبدالکریم صاحب۔ کلر کہار۔ ضلع جہلم	۱۰/-	۳۳۲۰
۱۵- پیر علی عرف صمد بابا صاحب۔ موضع ترکئی ضلع مردان	۱۰۰/-	۳۳۲۱
۱۶- احباب کویت معرفت محمد سرفراز خاں صاحب۔ کویت	۴۰۰/-	۳۳۲۲
۱۷- خلیل محمد صاحب۔ معرفت محمد انعام الحق صاحب راولپنڈی کینٹ	۵۰۰/-	۳۳۲۳
۱۸- عبدالقیوم خاں صاحب۔ روم۔ اٹلی	۵۰۰/-	۳۳۲۴
۱۹- ڈاکٹر محمد پرویز صاحب۔ غلام محمد آباد معرفت بزم طلوع اسلام فیصل آباد	۳۰/-	۳۳۲۵
۲۰- منیر احمد صاحب 〃 〃 〃 〃 〃	۲۰/-	۳۳۲۶
۲۱- چوہدری فضل الٰہی صاحب 〃 〃 〃 〃 〃	۲۰۰/-	۳۳۲۷
۲۲- خالد عزیز صاحب 〃 〃 〃 〃 〃	۵۰۰/-	۳۳۲۸

اسمائے گرامی	رقم	رسید نمبر
محترم		
۲۳- چوہدری بشیر احمد صاحب۔ غلام محمد آباد معرفت بزم طلوع اسلام فیصل آباد	۱۰۰/- روپے	۳۳۲۹
۲۴- بزم طلوع اسلام۔ کوئٹہ	〃 ۱۰۰/-	۳۳۳۰
۲۵- میر غضنفر اعوان صاحب۔ چمن معرفت بزم طلوع اسلام۔ کوئٹہ	〃 ۵۰/-	۳۳۳۱
۲۶- جابر بخاری صاحب 〃 〃 〃 〃 〃	〃 ۵/-	۳۳۳۲
۲۷- صفیہ بی بی صاحبہ 〃 〃 〃 〃 〃	〃 ۵/-	۳۳۳۳
۲۸- احمد حسین صاحب۔ ہیلن۔ نیو جرسی۔ امریکہ U.S.A	۱۰۰ ڈالر	۳۳۳۴
۲۹- مسز ظفر سعید صاحبہ۔ اسلام آباد	۳۰/- روپے	۳۳۳۵
۳۰- جاوید اقبال صاحب (کویت) معرفت بزم طلوع اسلام اسلام آباد	〃 ۵۰/-	۳۳۳۶
۳۱- محمد ارشد صاحب۔ چاریان۔ مری	〃 ۲۵/-	۳۳۳۷
۳۲- مسز اے۔ خان صاحبہ معرفت مس آر خان صاحبہ۔ بحرین	〃 ۲۵۸/-	۳۳۳۸
۳۳- ملک حنیف وقبانی صاحب۔ مری	〃 ۵۰/-	۳۳۳۹
۳۴- نمائندہ بزم طلوع اسلام۔ راولپنڈی	〃 ۱۰،۰۰۰/-	۳۳۴۰
۳۵- نام کی اشاعت نہیں چاہتے۔	〃 ۲۰۰/-	۳۳۴۱
۳۶- ڈاکٹر رشید ارشد صاحب۔ مریدکے	〃 ۱۰۰/-	۳۳۴۲
۳۷- چوہدری محمد نواز صاحب۔ راولپنڈی	〃 ۱۰۰/-	۳۳۴۳
۳۸- عطیہ شفیق صاحبہ۔ کراچی	〃 ۱۰۰۰/-	۳۳۴۴
۳۹- نام اور پتہ ظاہر نہیں کیا۔ (لاہور)	〃 ۵۰/-	۳۳۴۵
۴۰- مولانا ایم ایس عثمانی صاحب۔ جوہانسبرگ۔ ساؤتھ افریقہ	〃 ۳۱۰/۲۵	۳۳۴۶
۴۱- رشید احمد بٹ صاحب۔ بریڈ فورڈ۔ یوکے	〃 ۱۰۰۰/-	۳۳۴۷
۴۲- وقار اکرم صاحب نڈگر 〃 〃	〃 ۱۱۳۰/-	۳۳۴۸
۴۳- بیگم محمد اکرم صاحبہ 〃 〃	〃 ۲۲۸/-	۳۳۴۹
۴۴- محمد اکرم صاحب نڈگر 〃 〃	〃 ۱۱۴/-	۳۳۵۰
میزان =	۱۲،۱۹۰/۲۵ + ۱۰۰ ڈالر	
سابقہ میزان =	۸۲،۲۸۰/۰۳	
کل میزان =	۹۴،۴۷۰/۲۸ + ۱۰۰ $	

سرمایہ داروں کا انجام

پرویز

مکافاتِ عمل کے موضوع پر محترم پرویز صاحب کے سلسلۂ مضامین کی پہلی کڑی "ظالم بچ نہیں سکتا" طلوعِ اسلام کی اشاعت بابت مئی ۱۹۸۰ء میں شائع ہوئی تھی۔ اس سلسلہ کی دوسری کڑی "مفسدین کا انجام" — طلوعِ اسلام کی اشاعت بابت جولائی ۱۹۸۰ء میں شائع ہو چکی ہے۔ زیرِ نظر مقالہ میں اسی سلسلہ کی تیسری کڑی پیشِ خدمت ہے۔

"سرمایہ داروں" کے لئے قرآنِ کریم میں دو اصطلاحات عام طور پر آتی ہیں۔

(۱) اَلْمَلَأُ — (مَلَأَ — یَمْلَأُ — مَلْأٌ) کے بنیادی معنے ہیں، کسی چیز کو بھر دینا — اس اعتبار سے اَلْمَلَأُ ان لوگوں کو کہتے ہیں جن کے گھر ضروریاتِ زندگی کی اشیاء سے بھرے ہوئے ہوں۔ جنہیں سامانِ زیست بڑی فراوانی سے حاصل ہو۔ چونکہ، غیر خداوندی نظام میں عزت اور سیادت کا معیار، دولت ہوتی ہے۔ اس لئے یہی لوگ قبیلہ یا قوم کے سردار بھی ہوتے تھے اس لئے تبعاً یہ لفظ (اَلْمَلَأُ) سردارانِ قوم کے لئے بھی استعمال ہوتا تھا۔ لیکن اس سے بنیادی طور پر مراد سرمایہ دار طبقہ ہی تھا۔

(۲) مُتْرَفِیْنَ — وہ لوگ جو عیش و آرام کی زندگی گزار رہے ہوں۔ ایسے خوشحال لوگ جن کے پاس کثرت سے دولت ہو، اور اس بنا پر وہ بڑے خود سر ہو جائیں۔ قرآنِ کریم نے مُتْرَفِیْنَ کی وضاحت خود ہی کر دی ہے جہاں کہا ہے کہ یہ وہ لوگ ہیں۔ قَالُوْا نَحْنُ اَكْثَرُ اَمْوَالًا وَّ اَوْلَادًا ۙ وَّمَا نَحْنُ بِمُعَذَّبِيْنَ۔ (۳۴/۳۵) جو کہتے ہیں کہ ہمارے پاس بڑی کثرت سے دولت ہے اور ہمارا قبیلہ اور جتھہ بھی بہت بڑا ہے۔ ہم جو جی میں آئے، کریں۔ ہمیں کون ہاتھ لگا سکتا ہے؟

قرآنِ کریم بتاتا ہے کہ یہ لوگ ہمیشہ دینِ خداوندی کی مخالفت کرتے رہے ہیں۔ چنانچہ وہ آسمانی دعوتِ انقلاب کے داعیٔ اوّل حضرت نوحؑ کے تذکرہ جلیلہ کے ضمن میں کہتا ہے۔

ہم نے نوحؑ کو اس کی قوم کی طرف پیغامبر بنا کر بھیجا۔ اس نے اُن سے کہا کہ تم قوانینِ خداوندی کی محکومیت اختیار کرو۔ اس کے سوا کوئی ایسی قوت نہیں جس کی محکومی اختیار کی جائے اگر تم نے ایسا نہ کیا (اور اپنی موجودہ روش پر اڑے رہے تو) مجھے نظر آتا ہے کہ تم پر سخت تباہی آجائے گی۔ (۷/۵۹)

آپ نے پیغام دیکھ لیا۔ یہ پیغام ساری قوم کے لئے تھا۔ لیکن قوم میں سے بھڑک کر کون سا طبقہ اٹھا؟ سنیئے۔

قَالَ الْمَلَأُ مِنْ قَوْمِهٖٓ اِنَّا لَنَرٰىكَ فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ۔ (۷/۶۰)

اس قوم کے دولت مند سرمایہ دار طبقہ نے کہا کہ ہم دیکھتے ہیں کہ تم عجیب اُلٹے راستے پہ چل رہے ہو۔ (ہمیں اس روش پہ چلنے سے اس قدر مال و دولت حاصل ہے اور تم کہہ رہے ہو کہ اس سے ہم پہ تباہی آجائے گی)

سورۂ ھُوْدؑ میں اس اجمال کی تفصیل دی گئی ہے جہاں کہا ہے کہ

اس پر قوم کے سرمایہ دار طبقہ نے کہا کہ ہم تو دیکھتے ہیں کہ تم ہمارے ہی جیسے ایک انسان ہو۔ (اس لئے ہم کیسے مان لیں کہ تم خدا کے رسول ہو) باقی رہے یہ لوگ جو تمہارے پیچھے لگ گئے ہیں تو ان کی حیثیت ہی کیا ہے؟ یہ ہم میں سے نچلے درجے کے لوگ ہیں اور یہ صاف دکھائی دے رہا ہے کہ انہوں نے تمہارا مسلک عقل و فکر کی رُو سے اختیار نہیں کیا۔ یونہی بلا سوچے سمجھے تمہارے ساتھ ہو لئے ہیں۔ ہمیں تو کوئی ایسی بات نظر نہیں آتی جس میں تمہیں ہمارے مقابلہ میں کوئی برتری حاصل ہو ــــ لہٰذا، ہم تو یہی سمجھتے ہیں کہ تم اپنے اس دعوے میں جھوٹے ہو۔ (۱۱/۲۷)

یہاں سے یہ بات بھی واضح ہو گئی کہ قوم کے غریب اور کمزور طبقہ نے اس دعوت پہ لبیک کہا اور دولتمند اور طاقت ور طبقہ نے اس کی مخالفت کی تھی۔ اس کے بعد یہ بتایا گیا ہے کہ اس دولت مند طبقہ کی طرف سے یہ مطالبہ پیش کیا گیا کہ تم ان غریب اور نادار لوگوں کو دھتکار کر نکال دو تو پھر ہم تمہاری بات سننے کے لئے آمادہ ہو سکیں گے۔ اس پہ حضرت نوحؑ نے کہا کہ

تم اس پر غور کرو کہ میں جو کچھ تمہاری بھلائی کے لئے کرنا چاہتا ہوں، اس کے معاوضہ میں تم سے کوئی مال و دولت نہیں مانگتا۔ لیکن میں یہ نہیں کر سکتا کہ جو لوگ اس نظام کی صداقت پر ایمان لائے ہیں، انہیں اس لئے نکال باہر کر دوں کہ وہ غریب و نادار ہیں اور اس لئے تم انہیں ذلیل سمجھتے ہو ــــ میں اگر تمہاری خاطر ان لوگوں کو دھتکار دوں، تو اس سے تم تو بیشک خوش ہو جاؤ گے، لیکن ذرا سوچو کہ قانونِ خداوندی کی رُو سے اس جرم کی جو سزا مجھ پہ وارد ہو جائے گی اس سے مجھے کون بچا سکے گا؟ ..... تم جو یہ سمجھتے ہو کہ یہ لوگ جنہیں تم اپنے معیار کے مطابق ذلیل اور حقیر خیال کرتے ہو، خدا کی نظروں میں بھی ذلیل و حقیر ہیں، اور انہیں اس کے ہاں سے کوئی خوشگواری کا سامان نہیں مل سکتا، یہ غلط ہے قانونِ خداوندی کی رُو سے معیارِ عزت و تکریم اور استحقاقِ خیر و برکت انسان کے جوہرِ ذاتی ہیں۔ اس کی نگاہ کسی کے مال و دولت پہ نہیں، بلکہ انسان کے دل پہ ہوتی ہے۔ اگر میں تمہاری بات مان لوں، تو میں بھی تمہارے ہی جیسا ظالم ہو جاؤں۔ (۱۱/۳۱-۲۹)

آپ کو معلوم ہے کہ انہوں نے اس کا جواب کیا دیا؟ وہی، جو ہر ایسا شخص دیا کرتا ہے جو دولت و قوت کے نشہ میں بدمست ہو۔ انہوں نے کہا:-

اے نوحؑ! ہم نے تم سے یونہی ذرا سی بات کی تھی اور تم ہو کہ آگے ہی آگے بڑھتے چلے جا رہے ہو۔ ہم تمہاری کوئی بات سننے کے لئے تیار نہیں۔ تم جس تباہی کی دھمکی دے رہے ہو اسے لے آؤ ـــــ ہم دیکھیں کہ وہ ہمارا کیا بگاڑ لیتی ہے۔ (۱۱/۳۲)

سورۃ الشعراء میں ہے کہ ان امرائے قوم نے کہا کہ

اے نوحؑ! تم یہ کیا کہہ رہے ہو؟ کیا ہم تمہیں اپنا لیڈر تسلیم کر لیں اور اس طرح تمہاری اس جماعت میں شامل ہو جائیں جس میں سوسائٹی کے وہ لوگ شامل ہیں جو نہایت پست اور ذلیل ہیں اور ادنیٰ ادنیٰ کام کاج کرتے ہیں (وہ مزدور اور محنت کش ہیں۔ کیا ہم اس جماعت میں شامل ہو کر ان لوگوں کو اپنا ہمسر بنا لیں؟ یہ کیسے ممکن ہے؟) (۲۶/۱۱۱)

اس پر حضرت نوحؑ نے کہا کہ مجھے اس سے غرض نہیں کہ میں معلوم کروں کہ یہ لوگ کیا کام کرتے ہیں۔ ہمارے ہاں تو یہ دیکھا جاتا ہے کہ یہ لوگ صداقت کو کس قدر تسلیم کرتے ہیں اور اس نظام کے قیام کے لئے کیا کام ہیں، جسے میں پیش کرتا ہوں۔ یہی ہمارے ہاں قدر و قیمت کے پیمانے ہیں۔ میرے نزدیک یہ غریب و نادار لوگ جو اس نظام کے قیام کے لئے میرے رفیقِ کار بنے ہیں، ان سردارانِ قوم سے کہیں زیادہ واجب الاحترام ہیں جو اس کی مخالفت کرتے ہیں۔ (۲۶/۱۱۱-۱۱۴)

سورۃ المؤمنون میں ہے کہ ان رؤسائے قوم نے اپنے طبقہ کے دیگر افراد سے کہا کہ یاد رکھو! اس شخص سے بڑا محتاط رہنے کی ضرورت ہے۔ یہ تو ہم پر بالادستی (SUPERIORITY) حاصل کرنا چاہتا ہے۔ یہ چاہتا ہے کہ تم پر اپنا نظام مسلط کر دے۔ اس کا (معاذ اللہ) دماغ چل گیا ہے۔ یہ پاگل ہو گیا ہے جو کہتا ہے کہ امیر اور غریب سب ایک جیسے ہیں۔ تم چند دنوں تک انتظار کرو۔ اس کی یہ تحریک خود بخود ناکام ہو جائے گی۔ (۲۳/۲۴)

لیکن، آخر الامر ہوا یہ کہ انہی نادار لوگوں اور غریبوں کی جماعت محفوظ رہی، اور وہ جو سامانِ زیست کی فراوانیوں سے اس قدر بدمست ہو رہے تھے، غرق ہو گئے۔

حق و باطل کی کشمکش کی اس پہلی کڑی کو بیان کرنے کے بعد، قرآن کریم کہتا ہے کہ اس سرگزشت میں تمہارے لئے، ہمارے قانونِ مکافات کی ہمہ گیری کی نشانیاں ہیں۔ اس سے واضح ہو جاتا ہے کہ ہم غلط نظام کو کس طرح الٹا کر رکھ دیا کرتے ہیں۔ (۲۳/۳۰)

قومِ نوحؑ کے بعد، ہمارے سامنے قومِ عاد کا تذکرہ آتا ہے جس کی طرف حضرت ہودؑ مبعوث ہوئے تھے۔ انہوں نے بھی قوم کے سامنے اسی انقلاب آفرین نظامِ زندگی (دین) کو پیش کیا جسے حضرت نوحؑ نے پیش کیا تھا۔ اس کے جواب میں قَالَ الْمَلَأُ الَّذِينَ كَفَرُوا مِن قَوْمِهِ۔ اس قوم کے بڑے بڑے سرغنوں نے جنہیں مال و دولت کی فراوانی حاصل تھی، اور جو اس دعوت کی مخالفت کے لئے اٹھ کھڑے ہوئے تھے، کہا کہ

ہمیں تو ایسا نظر آتا ہے کہ تم عقل و ہوش کھو بیٹھے ہو۔ تم جو کہتے ہو کہ ہماری روش ہمیں تباہیوں کی طرف لے جا رہی ہے' یہ سب جھوٹ ہے۔ (۲۶/۲۳ نیز ۱۳۳/۲۶)

اس قوم کو رزق کی کس قدر فراوانیاں حاصل تھیں اور اس کے بل بوتے پر انہوں نے خلقِ خدا پر کس طرح گوشۂ عافیت تنگ کر رکھا تھا، اس کے ضمن میں قرآنِ کریم کہتا ہے کہ

حضرت ہودؑ نے ان سے کہا کہ ذرا دیکھو کہ تمہیں اس وقت سامانِ زیست کس قدر فراواں حاصل ہے۔ مال مویشی کی کثرت، افرادِ قبیلہ کی بہتات، لہلہاتے باغ، اُن کی سیرابی کے لئے رواں دواں چشمے (یہ سب خدا کی عطا کردہ ذرائع رزق ہیں جسے اس نے تمام انسانوں کی پرورش کے لئے پیدا کیا تھا، لیکن تم اسے کمزوروں اور ناداروں پر ظلم کرنے کے لئے استعمال کرتے ہو۔ تمہاری حالت یہ ہے کہ تم اپنی بڑائی کے اظہار کے لئے اونچی اونچی پہاڑیوں پر اس قسم کے میموریل بناتے ہو جن کا کوئی مصرف نہیں۔ ان سے بھلا نوعِ انسانی کو کیا فائدہ پہنچ سکتا ہے؟ اور تم بڑے بڑے ساز و سامان (اور اسلحہ وغیرہ) بناتے ہو۔ اس لئے نہیں کہ اس سے ظلم کی روک تھام کرو۔ بلکہ اس لئے کہ کمزوروں پر تمہارے آہنی پنجے کی گرفت ڈھیلی نہ ہونے پائے اور تمہارا غلبہ و تسلط ہمیشہ ہمیشہ کے لئے قائم رہے۔ تم اس روش کو چھوڑ دو اور قوانینِ خداوندی کی نگہداشت کرو۔ (۲۶/۱۳۵-۱۲۸)

اس طبقہ کی طرف سے اس کا ردِّ عمل کیا تھا؟ قرآن بتاتا ہے کہ

(انہوں نے یہ سب کچھ سنا اور نہایت طنز اور حقارت سے کہا کہ آپ کے اس وعظ کا شکریہ! ہمیں اس کی ضرورت نہیں) ہمارے لئے تمہارا وعظ و نصیحت کرنا، نہ کرنا، برابر ہے (خدا اور اس کا قانونِ مکافات، تباہیوں اور بربادیوں کا عذاب' جس سے تم ہمیں ڈراتے ہو۔ یہ سب) اگلے زمانے کے لوگوں کے من گھڑت افسانے ہیں۔ ہم پر کوئی تباہی نہیں آ سکتی۔ (۲۶/۱۳۹-۱۳۶)

وہ کوئی جاہل اور گنوار قوم نہیں تھی۔ ان کے پاس :-

سننے کے لئے کان' دیکھنے کے لئے آنکھیں' اور سمجھنے سوچنے کے لئے دل و دماغ تھے۔ لیکن جب انہوں نے قوانینِ خداوندی کی اس طرح مخالفت کی تو ان کی سماعت و بصارت و قلب ان کے کسی کام نہ آ سکے۔ ان کا علم و عقل انہیں اس تباہی سے نہ بچا سکا۔ جس کا وہ مذاق اڑایا کرتے تھے۔ (۴۶/۲۶)

حضرت ہودؑ نے ان سے کہا تھا کہ "اگر تم نے اس غلط روش کو نہ چھوڑا، تو تمہاری جگہ ایک اور قوم آ جائے گی جس کا نظام' تمہارے نظام کی ضد ہوگا"۔ (۱۱/۵۷) یہ ہے خدا کے قانونِ مکافات کی رُو سے' قوموں کے استبدال و استخلاف (SUCCESSION AND SUBSTITUTION) کا اصول جس کی رُو سے وہ قوم جو غلط نظامِ حیات کی حامل ہو، تباہ و برباد ہو جاتی ہے۔ اور اس کی جگہ وہ

قوم لے لیتی ہے جو صحیح نظام کی حامل ہو۔

قوم عاد کے بعد ہمارے سامنے قوم ثمود آتی ہے جس کی طرف حضرت صالحؑ دعوتِ انقلاب لے کر آئے تھے۔ وہ زمانہ گلہ بانی کا تھا۔ معیشت کا مدار مویشی تھے۔ اور ان مویشیوں کی زندگی کا مدار چراگاہوں اور پانی کے چشموں پر تھا۔ اس قوم کے بالادست طبقہ نے ان ذرائع پیداوار کو اپنی ملکیت میں لے رکھا تھا جس کا نتیجہ یہ تھا کہ کمزوروں کے جانوروں کو ان میں گھسنے نہیں دیا جاتا تھا۔ ان کی پانی کی باری ہی نہیں آتی تھی۔ معلوم ہوتا ہے کہ خاندانی اعتبار سے حضرت صالحؑ کا تعلق بھی اسی طبقہ سے تھا۔ لیکن انہوں نے ان کی اس باطل روش کے خلاف اعلانِ انقلاب کیا تو انہوں نے کہا کہ

یٰصٰلِحُ قَدْ كُنْتَ فِيْنَا مَرْجُوًّا قَبْلَ هٰذَا۔ (۱۱/۶۲)

اے صالحؑ! ہماری تو تمہارے ساتھ بڑی بڑی توقعات وابستہ تھیں۔ تم تو ہماری اُمیدوں کے مرکز تھے۔ تم یہ کیا کرنے لگ گئے؟

یہ کہنے والے کون تھے؟ وہی اَلْمَلَاُ الَّذِيْنَ اسْتَكْبَرُوْا مِنْ قَوْمِهٖ۔ (۷/۷۵) اس کی قوم کا وہ دولتمند طبقہ جس نے دھاندلی مچا رکھی تھی۔

اور حضرت ہودؑ نے ان سے کیا کہا تھا جس پر یہ ان کی طرف سے اس قدر مایوس ہو کر بگڑ بیٹھے تھے؟ ــــ انہوں نے کہا تھا کہ

دیکھو! خدا نے تمہیں اس ملک میں کس قدر تمکن عطا کیا ہے۔ تم میدانوں میں محلات تعمیر کرتے ہو۔ پہاڑوں کو تراش تراش کر ان میں مکانات بناتے ہو۔ تم خدا کی ان نعمتوں کو اپنے پیشِ نظر رکھو اور ملک میں فساد مت برپا کرو۔ (۷/۷۴)

پھر انہوں نے کہا۔ کہ

ذرا سوچو کہ اگر تم نے اپنا معاشی نظام اسی قسم کا رکھا جس سے معاشرہ میں اس قدر ناہمواریاں پیدا ہو جائیں۔ تو کیا یہ آسائشیں اور فارغ البالیاں اسی طرح رہنے دی جائیں گی۔ کیا تم ان لہلہاتے باغات اور چشموں میں، ان زرخیز زمینوں میں۔ ان نخلستانوں میں جہاں درختوں پر پھلوں کے نرم اور خوشگوار خوشے تہ بہ تہ لٹک رہے ہیں۔ اور ان قلعہ نما محلوں میں جنہیں تم پہاڑوں کو تراش کر بڑی صنعت کاری سے بناتے ہو اور پھر اتراتے ہو کہ یہاں تمہارا کوئی بال بیکا نہیں کر سکتا ــــ اسی طرح رہو گے؟ کیا تم سمجھتے ہو کہ اس غلط معاشی نظام کے باوجود یہ تمام خوشحالیاں علےٰ حالہٖ قائم رہیں گی! (۲۶/۱۴۶-۱۴۹)

اس پر انہوں نے وہی حربہ اختیار کیا جو ابلیسی سیاست کے علمبردار اختیار کیا کرتے ہیں۔ یعنے انہوں نے حضرت ہودؑ سے تو کچھ نہ کہا، کیونکہ ان کا خاندان بڑا تھا۔ لیکن ان کے متبعین کو جو غریبوں، اور کمزوروں پر مشتمل تھے، دھمکانا شروع کر دیا۔ سورۂ اعراف میں ہے:-

اس پر اُس قوم کے سرکش اکابرین نے، جنہیں مال و دولت کی فراوانی نے بدمست کر رکھا تھا، جماعتِ مومنین سے کہا —— اور یہ وہ لوگ تھے جنہیں وہ اکابرین، ان کے افلاس کی وجہ سے بہت کمزور اور حقیر سمجھتے تھے —— کہ کیا تم واقعی یہ سمجھتے ہو کہ صالحؑ خدا کا رسول ہے؟ اگر تم ایسا سمجھتے ہو تو تمہیں معلوم ہونا چاہیئے کہ ہم اسے ایسا تسلیم نہیں کرتے۔ (اس لئے تم خود سمجھ لو کہ جس روش کو ہم صحیح نہیں سمجھتے اس پر چلنے سے تمہارا کیا حشر ہوگا)۔

(7/75-76)

جب یہ حربہ بھی کارگر نہ ہوا تو انہوں نے حضرت صالحؑ سے مصالحت کی کوشش کی۔ اور ان سے پوچھا کہ آپ چاہتے کیا ہیں؟ انہوں نے کہا کہ میں اس کے سوا اور کیا چاہتا ہوں کہ خدا نے جو رزق تمام انسانوں کی پرورش کے لئے پیدا کیا ہے، اسے تمام انسانوں کے لئے کھلا رکھا جائے۔ ہر ایک کے مویشی چراگاہوں میں چریں اور اپنی اپنی باری چشموں سے پانی پیئیں۔ اس پر وہ راضی ہو گئے تو حضرت صالحؑ نے کہا کہ مجھے اس کا عملی ثبوت ملنا چاہیئے کہ تم اس معاہدہ پر کاربند رہتے ہو۔ اس وقت تمہاری حالت یہ ہے کہ تم نے خدا کی زمین پر لکیریں کھینچ کر —— یہ میری اور یہ تیری —— کی تفریق پیدا کر رکھی ہے۔ اور "میری زمین میں میرے مویشی چر سکتے ہیں اور تیری زمین میں تیرے" حالانکہ نہ زمین میری اور تیری ہو سکتی ہے اور نہ ہی اس مقصد کے لئے میرے اور تیرے مویشیوں کی تفریق —— یہ ایک اونٹنی ہے جسے یوں سمجھو کہ یہ نہ میری ہے، نہ تیری —— اور اسے میں چراگاہ میں چھوڑتا ہوں:-

هٰذِهٖ نَاقَةُ اللّٰهِ —— تَاْكُلْ فِیْۤ اَرْضِ اللّٰهِ۔ (7/73)

یہ خدا کی اونٹنی ہے، جو خدا کی زمین میں چرے گی۔

اگر تم نے اسے اس طرح چرنے دیا، تو سمجھ لیا جائے گا کہ تم میرے تجویز کردہ معاشی نظام پر کاربند رہو گے۔ لیکن اگر تم نے اسے اس سے روکا تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ تم اس تبدیلی کو گوارہ نہیں کر سکتے اور اپنی روش پر قائم رہنا چاہتے ہو۔

قوم کے سرمایہ داروں نے ماننے کو تو اسے مان لیا لیکن جب دیکھا کہ غریبوں کے مویشی اور ان کے جانور سب برابر کر دیئے گئے ہیں تو ان کے سینوں میں حسد و رقابت کی آگ بھڑک اٹھی —— فَعَقَرُوْهَا۔ (26/157) انہوں نے غم و غصہ سے پاگل ہو کر اس اونٹنی کو مار ڈالا۔ (نیز 7/77، 11/65) —— اور اپنے اسی سابقہ معاشی نظام کی طرف لوٹ گئے۔ اس کا نتیجہ کیا ہوا؟ فَدَمْدَمَ عَلَیْهِمْ رَبُّهُمْ بِذَنْۢبِهِمْ فَسَوّٰىهَا۔ (91/14)۔ خدا کا قانونِ مکافاتِ عمل ان پر روڈ رولر (ROAD ROLLER) کی طرح پھر گیا اور انہیں زمین کی سطح کے ساتھ ہموار کر کے رکھ دیا۔

حذر اے چیرہ دستاں سخت ہیں فطرت کی تعزیریں

اسی طرح قوم مدین کی طرف، حضرت شعیبؑ مبعوث ہوئے۔ اس قوم کی معیشت گلہ بانی بھی تھی اور

کاروباری بھی۔ ان کے زرعی نظام کی کیفیت کیا تھی؟ اس کا اندازہ حضرت موسیٰؑ کے اس واقعہ سے لگائیے جو اس بستی سے باہر پیاؤ پہ پیش آیا:۔

حضرت موسیٰؑ جب مصر سے بھاگ کر مدین کے قریب آئے تو وہ سستانے کے لئے ایک چشمے کے قریب درخت کے سائے میں بیٹھ گئے۔ انہوں نے دیکھا کہ چشمے پہ مویشی غٹا غٹ پانی پی رہے ہیں لیکن دو لڑکیاں ہیں جو پیاؤ سے دور کھڑی ہیں۔ ان کے مویشی پیاس کے مارے قابو سے باہر ہوئے جا رہے ہیں لیکن وہ انہیں چشمے کی طرف جانے سے روکتی ہیں۔ حضرت موسیٰؑ کو اس پہ تعجب ہوا کہ وہ انہیں پانی کی طرف جانے سے روکتی کیوں ہیں؟ چنانچہ ان کے دریافت کرنے پہ لڑکیوں نے جواب دیا کہ

جب تک یہ چرواہے اپنی بکریوں کو پانی پلا کر نہ لے جائیں، ہم اپنی بکریوں کو پانی نہیں پلا سکتیں۔ اس لئے کہ یہ لوگ بڑے بڑے جتھوں کے مالک اور صاحبِ قوت ہیں۔ اور ہمارے ہاں کوئی آدمی نہیں۔ صرف ایک باپ ہے جو بہت بوڑھا ہے۔ (۲۸/۲۳)

حضرت موسیٰؑ نے دل میں کہا کہ —— بہر زمینے کہ رفتیم آسماں پیداست —— مصر سے بھاگا تھا کہ وہاں فرعونیوں کی بالادست قوم نے بنی اسرائیل پہ عرصۂ حیات تنگ کر رکھا تھا۔ یہاں پہنچا تو معاملہ وہاں سے بھی زیادہ الم انگیز نظر آیا۔ وہاں ایک قوم دوسری قوم کو تنگ کرتی تھی۔ یہاں ایک ہی قوم کا ایک طبقہ دوسرے طبقہ کو پانی کے چشمے کے قریب آنے نہیں دیتا۔ یہ جی میں کہا اور اٹھ کر ان غریب لڑکیوں کی بکریوں کو خود پانی پلا دیا اور پھر درخت کے نیچے آکر بیٹھ گئے۔ اور گہری سوچ میں ڈوب گئے۔ (۲۸/۲۴) کہ

خداوندا! یہ تیرے سادہ دل بندے کدھر جائیں؟

یہ تھی قومِ مدین کی زرعی معیشت کی حالت۔ جہاں تک ان کی کاروباری زندگی کا تعلق ہے، ان کی کیفیت وہی تھی جو ہر سرمایہ دار قوم کی ہوتی ہے۔ حضرت شعیبؑ نے ان کی یہ حالت دیکھی تو ان سے کہا کہ

تمہیں چاہیئے کہ اپنے معاشی نظام میں عدل برتو۔ ماپ تول کو پورا رکھو۔ لوگوں کے حقوق و واجبات میں کمی نہ کرو۔ اور معاشرہ میں ہمواریاں پیدا ہو جانے کے بعد ناہمواریاں مت پیدا کرو۔ یہ سب کچھ تمہارے ہی بھلے کے لئے ہے، اگر تم یقین کرو تو۔

دیکھو! ایسا نہ کرو کہ زندگی کے ہر راستے پہ راہزن بن کر بیٹھ جاؤ اور جو لوگ صحیح نظامِ خداوندی کے قیام کے لئے اٹھیں، انہیں دھمکیاں دے دے کر اس راستے سے روکو اور انسانیت کی راہ میں پیچ و خم پیدا کرنے کے درپے رہو۔ (۷/۸۵-۸۶) نیز (۲۶/۱۸۱-۱۸۴)۔

شروع شروع میں انہوں نے حضرت شعیبؑ کی اس دعوت کو (SERIOUSLY) نہ لیا۔ اور ان سے صرف اتنا کہا ——— اِنَّمَآ اَنْتَ مِنَ الْمُسَحَّرِيْنَ۔ (۲۶/۱۸۵) "ہمیں ایسا نظر آتا ہے کہ تو بھی انہی میں سے ہے، جو اس فریب میں مبتلا ہو کر، کہ خدا ان سے باتیں کرتا ہے، قوم کے مصلح بننے کی کوشش کیا کرتے ہیں"۔ حضرت شعیبؑ نے ان سے کہا کہ باقی معاملات تو بعد میں دیکھے جائیں گے، تم اس وقت اتنا تو کرو کہ میری صلوٰۃ میں مداخلت نہ کرو۔ انہوں نے اپنے جی میں سمجھا کہ یہ اپنے طور پہ پوجا پاٹ کرنا چاہتا ہے سو اسے ایسا کرنے دو۔ اس سے ہمارا کیا بگڑتا ہے چنانچہ

نے کہدیا، کہ ہم تمہاری صلوٰۃ میں مزاحمت نہیں کریں گے لیکن انہوں نے دیکھا کہ شعیبؑ کے نزدیک "صلوٰۃ" سے مفہوم پرستش نہیں، کچھ اور ہے۔ چنانچہ انہوں نے اس سے کہا کہ

يٰشُعَيْبُ - اَصَلٰوتُكَ تَاْمُرُكَ اَنْ نَّتْرُكَ مَا يَعْبُدُ اٰبَآؤُنَآ اَوْ اَنْ نَّفْعَلَ فِيْٓ اَمْوَالِنَا مَا نَشٰٓؤُا (۱۱/۸۷)۔

(تم جو کچھ کہتے تھے، اس سے ہم نے یہ سمجھا تھا کہ تم صرف پوجا پاٹ کا کوئی اپنا طریقہ لے کر آئے ہو اس لئے ہم نے تجھ سے کوئی تعرض نہیں کیا تھا۔ ہمارے ذہن میں تھا کہ ہم اپنے طریق پر پوجا پاٹ کرتے رہیں گے تم اپنے طریق پر کرتے رہو۔ لیکن ہم دیکھ رہے ہیں کہ یہ معاملہ پوجا پاٹ کا نہیں۔ تیری صلوٰۃ پرستش نہیں، یہ تو ہمارے روزمرّہ کی عملی زندگی کے ان شعبوں میں دخیل ہو رہی ہے جن کا مذہب سے کوئی تعلق نہیں، کیا تیری صلوٰۃ تجھ سے یہ کہتی ہے کہ ہم ان معبودوں کو چھوڑ دیں جن کی عبادت ہمارے اسلاف کرتے چلے آرہے ہیں۔ نیز یہ کہ ہم نہ اپنے طریق کے مطابق مال و دولت حاصل کریں، نہ ہی اسے اپنی مرضی کے مطابق صرف کریں۔ ہماری معاشی زندگی تمہاری مرضی کے تابع چلے ـــــ یہ انوکھی سی "صلوٰۃ" ہے!

(ضمناً) آپ نے غور فرمایا کہ "مذہب" میں صلوٰۃ (نماز) کا کیا مفہوم ہوتا ہے۔ اور "دین" میں صلوٰۃ کا مقصد کیا؟ دین کی رُو سے صلوٰۃ کا نظام، قوم کے معاشی نظام کو بھی اپنے دائرے کے اندر لئے ہوتا ہے۔ اسی نظام کے قائم کرنے کا حکم قرآن نے دیا تھا۔

بہرحال، جب قوم نے دیکھا کہ معاملہ آگے بڑھتا چلا جا رہا ہے اور یہ تحریک ہی کچھ اور ہے تو انہوں نے دھمکیاں دینی شروع کیں ـــــ قَالَ الْمَلَاُ۔

اس قوم کے سرمایہ دار طبقہ نے، جو قوت کے نشہ میں بدمست ہو رہے تھے، کہا کہ اے شعیبؑ! ان باتوں میں سے ایک ضرور ہوگی ـــــ یا تو تمہیں اور تمہارے ساتھیوں کو پھر سے وہی قدیم مسلک اختیار کرنا ہوگا جسے چھوڑ کر وہ تمہارے ساتھ ہو لئے ہیں، اور یا پھر ہم تمہیں اور تمہارے ساتھیوں کو بستی سے نکال دیں گے۔ اب تم خود سوچ لو کہ تمہیں کیا کرنا ہے (۷/۸۸)۔

قوم نے اپنی روش کو نہ چھوڑا اور اپنے غلط نظام کی وجہ سے تباہ و برباد ہو گئی (۲۹/۳۶)

اور داستانِ، صاحبِ ضربِ کلیم، حضرت موسیٰؑ تو ہے ہی ـــــ ملوکیت، مذہبی پیشوائیت اور نظامِ سرمایہ داری تینوں کے خلاف۔ بیک وقت دعوتِ مبارزت۔ فرعون، ملوکیت کے استبداد کا مجسمہ ـــــ ہامان، مذہبی پیشوائیت کی روباہ بازیوں کا نمائندہ ـــــ اور قارون، نظامِ سرمایہ داری کی ہوسِ خون آشامی کا پیکر۔ لیکن جہاں تک فرعون کا تعلق ہے، اس نے بھی اپنی مملکت کے استحکام کے لئے قوم کے

ذرائع رزق کو اپنے قبضہ میں لے رکھا تھا۔ چنانچہ جب حضرت موسیٰؑ نے وہاں انقلابی نعرہ بلند کیا تو اس نے اپنی قوم سے کہا :-

اے میری قوم کے لوگو! سوچو کہ کیا مصر کا ملک اور یہ نہریں جو میرے انتظام کے ماتحت جاری ہیں، اور جن پر تمہاری معیشت کا دار و مدار ہے، میری نہیں؟ (۴۳/۵۱)

یہ درحقیقت قوم کو بہت بڑی دھمکی دی گئی تھی کہ اگر تم میں سے کسی نے اس داعیٔ انقلاب کا ساتھ دیا تو اس پر معیشت کے دروازے بند کر دیئے جائیں گے۔

فرعون کے ساتھ حضرت موسیٰؑ کے تصادم کی داستان الگ ہے۔ اس کی تفصیل میں جانے کا یہ مقام نہیں۔ جہاں تک نظامِ سرمایہ داری کے خلاف کشمکش کا تعلق ہے، قرآن کریم نے اس کے تذکرہ کی ابتداء ہی بڑے مزاحیہ انداز سے کی ہے جب کہا ہے کہ ـــــ اِنَّ قَارُوْنَ كَانَ مِنْ قَوْمِ مُوْسٰى فَبَغٰى عَلَيْهِمْ ۔ (۲۸/۷۶) ـــــ قارون تو ایک دوسری قوم کا آدمی تھا، جس نے بنی اسرائیل کو اپنی محکومیت کے شکنجے میں جکڑ رکھا تھا، لیکن قارون خود قومِ موسیٰؑ کا فرد تھا۔ یعنی نظامِ سرمایہ داری کی خون آشامی کی یہ حالت ہے کہ اس میں کوئی باہر سے آکر قوم کا خون نہیں چوستا۔ خود قوم کا ایک طبقہ دوسرے طبقہ کو لوٹتا ہے۔ دوسری مصیبت یہ ہوتی ہے کہ غیروں کی غلامی کی لعنت ہر کوئی محسوس کرتا ہے اور کسی بدترین غدار کے سوا، کوئی ان کا ہمنوا نہیں ہوتا۔ لیکن سرمایہ داروں کی عیش سامانیوں اور تن آسانیوں کو دیکھ کر دوسرے لوگوں کے دل میں بھی ان جیسا بن جانے کی ہوس پیدا ہو جاتی ہے چنانچہ قرآن کریم بتاتا ہے کہ

ایک طرف وہ لوگ تھے جو قارون کو زندگی کی صحیح روش اختیار کرنے کی نصیحت کرتے تھے اور دوسری طرف وہ تھے جن کے پیشِ نظر زندگی کی عیش سامانیاں تھیں۔ ان کی کیفیت یہ تھی کہ جب قارون کروفر اور شان و شوکت سے باہر نکلتا تو وہ بڑی حسرت سے کہتے کہ اے کاش! جو کچھ قارون کو ملا ہے، وہ ہمیں بھی مل جاتا۔ یہ بڑا ہی خوش نصیب ہے! (۲۸/۷۹)

جب قارون سے کہا جاتا کہ تم جو دوسری کی محنت کی کمائی کو اس طرح غصب کر کے اتنی دولت اکٹھی کر رہے ہو، تمہیں اس کا کیا حق پہنچتا ہے؟ تو معلوم ہے وہ اس کا کیا جواب دیتا؟ وہی جواب جو ہر دور میں ہر قوم کے سرمایہ پرست کی طرف سے ملتا ہے وہ کہتا: اِنَّمَآ اُوْتِيْتُهٗ عَلٰى عِلْمٍ عِنْدِيْ ۔ (۲۸/۷۸) یہ دولت میں نے اپنی ہنرمندی اور چابکدستی سے حاصل کی ہے۔ اس لئے کسی دوسرے کو کیا حق حاصل ہے کہ اس کی بابت مجھ سے کوئی باز پرس کرے؟

یہ کشمکش جاری رہی۔ اس کے بعد :-

جب قارون کی بدکرداریوں کے نتائج کے ظہور کا وقت آگیا۔ تو ہم نے اسے، اور اس کے مال و متاع سے بھرے ہوئے گھر کو تباہ کر دیا۔ اور اس وقت کوئی گروہ ایسا نہ نکلا جو قانونِ

خداوندی کے مقابلہ میں اس کی مدد کر سکتا، نہ ہی اس سے خود ہی ایسا ہو سکا کہ وہ اس تباہی سے بچ نکلتا۔ سرمایہ دار کی اقبال مندی کے زمانے میں ایسا نظر آتا ہے کہ ایک لشکر ہے جو اس کی خاطر اپنی جان تک قربان کر دے گا لیکن جب اس پہ ادبار آتا ہے تو ایک شخص بھی اس کا ساتھ دینے والا نہیں ہوتا۔ نہ ہی اس کی اپنی ہنرمندی اسے اس تباہی سے بچا سکتی ہے۔ (۲۸/۸۱)

حضرت داؤدؑ کے زمانے میں عام معاشی نظام کس قسم کا تھا، اسے قرآن کریم نے ایک قصہ کی شکل میں تمثیلی رنگ میں بیان کیا ہے۔ نظامِ سرمایہ داری کی بنیاد اس پر ہے کہ بڑا سرمایہ، چھوٹی پونجی کو اپنی طرف کھینچ لیتا ہے۔ اور اس طرح امیر، امیر تر اور غریب، غریب تر ہوتا چلا جاتا ہے۔ اس سلسلہ میں قرآن کریم میں ہے کہ ایک دفعہ حضرت داؤدؑ کے پاس ایک مقدمہ آیا جس میں :-

مستغیث نے کہا کہ فریقِ ثانی میرا اپنا بھائی ہے۔ لیکن دیکھو کہ یہ بھائی ہو کر میرے ساتھ کرنا کیا چاہتا ہے۔ اس کے پاس ننانوے دُنبیاں ہیں اور میرے پاس صرف ایک دُنبی جو میری معاش کا واحد سہارا ہے۔ اب بجائے اس کے کہ یہ اپنے غریب بھائی کی کچھ امداد کرے، مجھ سے کہتا ہے کہ اپنی ایک دُنبی بھی مجھے دے دے۔ چونکہ امیر آدمی ہے اور صاحبِ اثر بھی، اس لئے باتوں میں مجھے دبا لیتا ہے اور دوسرے لوگ بھی اس کی ہاں میں ہاں ملا دیتے ہیں ——— یہ ہے میرے اس بھائی کا میرے ساتھ برتاؤ۔ آپ بتائیے کہ کیا اس کا یہ مطالبہ جائز ہے؟ (۳۸/۲۳)

یہ تھا وہ غلط معاشی نظام جس کی اصلاح کے لئے حضرت داؤدؑ مامور ہوئے تھے۔ چنانچہ خدا نے آپ سے کہہ دیا کہ

(تم بلا خوف و خطر، اطمینان سے معاشرہ کی اصلاح کرو)۔ ہم نے تمہیں حکومت عطا ہی اس لئے کی ہے کہ تم لوگوں کے معاملات کے فیصلے حق کے ساتھ کیا کرو۔ اور کسی کے خیالات اور جذبات کے پیچھے مت لگو۔ اگر تم نے ایسا کیا تو یہ لوگ تمہیں راہِ راست سے بہکا دیں گے۔ (۳۸/۲۶)

مسیحِ انسانیت، حضرت عیسےٰؑ کی تو دعوت ہی ایک طرف "سود خوار یہودیوں" کے خلاف چیلنج، اور دوسری طرف رومیوں کی مستبد حکومت کے خلاف بغاوت تھی۔ لیکن سود خوار یہودی خود سامنے نہیں آتا تھا۔ جس طرح فرعون نے، مذہبی پیشوائیت (ہامان) کو حضرت موسےٰؑ کے خلاف اٹھا کھڑا کیا تھا۔ اسی طرح سرمایہ پرست یہودی ہیکل کے احبار و رہبان (علماء و مشائخ) کو آپ کے سامنے لے آئے تھے۔ اس آسمانی دعوت کی زد، ان مذہبی پیشواؤں پر کس طرح پڑتی تھی، اس کے متعلق انجیل برناباس کا

ایک اقتباس درج کر دینا کافی ہوگا۔ اس انجیل کی فصل ۱۴۲ میں ہے۔

تب ان لوگوں نے کاہنوں کے سردار کے خلاف مشورہ کیا اور کہا کہ اگر یہ آدمی بادشاہ ہو گیا تو ہم کیا کریں گے۔ البتہ ہم پر یہ بہت بڑی مصیبت ہوگی۔ اس لئے، کہ وہ اللہ کی عبادت میں قدیم طریقے کے مطابق اصلاح کرنی چاہتا ہے کیونکہ وہ تقالید (رسومات) کو باطل کرنے کی قدرت نہیں رکھتا۔ تب اس جیسے آدمی کی حکومت کے ماتحت ہمارا کیا انجام ہوگا۔ یقیناً ہم اور ہماری اولاد سب تباہ ہو جائیں گے اس لئے کہ ہم اپنی خدمت سے نکال دیئے جائیں گے تو ہم مجبور ہوں گے کہ اپنی روٹی عطیہ کے طور پر مانگیں۔

یہ وجہ تھی جو ہیکل کے احبار و رہبان، حضرت عیسیٰؑ کی اس انقلاب آفریں دعوت کی اس شدت سے مخالفت کرتے تھے۔

جب حضور خاتم الانبیاءؐ کی وساطت سے دین اپنی آخری اور مکمل شکل میں نوعِ انسانی کو دیا گیا تو نظامِ سرمایہ داری کے حاملین کی طرف سے اس کی مخالفت بھی اپنی انتہائی شدت تک پہنچ گئی۔ ہمارے ہاں عام طور پر نبی اکرمؐ کی بعثتِ مقدسہ کا مقصد اتنا ہی بتایا جاتا ہے کہ عہدِ جاہلیت میں عربوں میں شراب خوری جوئے بازی، باہمی جنگ و جدال، توہمانہ رسومات عام تھیں۔ حضورؐ ان قبیح رسومات کی اصلاح کے لئے تشریف لائے تھے۔ وہ لوگ بت پرست تھے اور آپؐ اسے شرک قرار دیتے تھے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ قریشِ مکہ اور ان کے ساتھ جملہ قبائلِ عرب نے جو اس دعوت کی مخالفت میں جانوں تک کی بازی لگا دی تھی تو کیا اس کی وجہ محض اتنی تھی کہ وہ ان عادات و رسومات کو چھوڑنا نہیں چاہتے تھے، جو عام اخلاقی اصولوں کی رُو سے بھی قابلِ مذمت اور درخورِ نفرت تھیں۔ زیادہ سے زیادہ ان کی بت پرستی کے متعلق کہا جا سکتا ہے۔ تو اس سلسلہ میں پہلی بات تو یہی قابلِ غور ہے کہ قرآنِ کریم نے مسلمانوں کو تاکید کر دی تھی کہ اُن کے معبودوں کو گالی تک نہ دیں ——— لہٰذا، ان کے اندازِ تبلیغ میں اشتعال انگیزی کا عنصر موجود ہی نہ تھا۔ دوسرے یہ کہ قرآنِ کریم کی رو سے مسلمان غیر مسلموں کو ان کے مذہب سے (خواہ وہ بُت پرست ہی کیوں نہ ہو) زبردستی روک نہیں سکتے تھے۔ تو پھر وہ کون سی بات تھی جس کی وجہ سے یہ سارا ملک اس دعوت کے خلاف میدانِ کارزار میں اتر آیا تھا۔ بالخصوص جب یہ جماعتِ مومنین مکہ چھوڑ کر مدینہ چلی آئی تھی تو پھر قریش کو کس بات کا خطرہ تھا جو انہوں نے وہاں بھی ان کا پیچھا نہ چھوڑا۔ اور چھ سات سال تک مسلسل، معرکہ آرائیاں ہوتی رہیں۔

اس اہم سوال کا جواب، ایک غیر مسلم نے دیا ہے جس نے تاریخ کا غیر جانبدارانہ مطالعہ کیا تھا۔ بات یوں ہوئی کہ جب چین میں امریکہ کے پٹھو، چیانگ کائی شک، کو کمیونسٹوں کے ہاتھوں بُری طرح شکست ہوئی تو اس سے امریکہ کو جس قدر خفت اٹھانی پڑی وہ ظاہر ہے۔ اہلِ امریکہ حیران اور متعجب تھے کہ ان کی اس قدر امداد کے باوجود چیانگ کائی شک اس طرح خاسر و نامراد کیوں رہ گیا۔ اس کی دیانتداری خود اپنی سیاست

کی) اس ناکامی کی وجہ دریافت کرنے کے لئے اکثر امریکی دیدہ ور چین پہنچے۔ ان میں ایک نامور جرنلسٹ (JACK BELDEN) بھی تھا۔ اس نے وہاں کی سیاحت کے بعد ایک کتاب شائع کی جس کا نام تھا (CHINA SHAKES THE WORLD) وہ اس کتاب کے پیش لفظ میں لکھتا ہے کہ تاریخ کے اس تحیر انگیز واقعہ (یعنی انقلاب چین) کے اسباب و علل دریافت کرنے کے لئے۔

نہ تو حکومتِ امریکہ اور امریکی پریس، نہ ہی امریکہ کے عوام اور ان کے وہ نمائندے جو مشرقِ بعید کے قونصل خانوں میں بیٹھے ہیں، نہ کاروباری حلقہ اور نہ ہی فوجی ادارے، اپنی نگاہ کو اپنے ذاتی یا قومی مفاد کی تنگ وادی سے آگے لے جاتے ہیں تاکہ وہ اہل چین کے دردآگیں اور جذبات سے لبریز قلوب تک پہنچ سکیں۔

اس کے بعد بیلڈن اس انقلاب عظیم کی حقیقی وجہ ان الفاظ میں بیان کرتا ہے:-

ان تمام لوگوں کو، جو اس انقلاب کی صحیح علت معلوم کرنا چاہتے ہیں، محمدؐ کے ان الفاظ کی یاد دلا دینا چاہیئے جو وہ مکہ کے تاجروں سے کہا کرتے تھے کہ

كَلَّا - بَل لَّا تُكْرِمُونَ الْيَتِيمَ - وَلَا تَحَاضُّونَ عَلَىٰ طَعَامِ الْمِسْكِينِ - (۸۹/۱۷-۱۹)

نہیں! تمہاری تباہی کی وجہ وہ نہیں جو تم سمجھے بیٹھے ہو۔ اس کی اصل وجہ یہ ہے کہ تم اس شخص کو واجب التکریم نہیں سمجھتے تھے جو معاشرہ میں تنہا رہ جائے اور ایک دوسرے کو اس شخص کی مدد کرنے کی تلقین نہیں کرتے تھے جس کی چلتی گاڑی رک جائے۔

یہ تھا آپؐ کا وہ انقلاب آفریں پیغام جس کی وہ لوگ مخالفت کرتے تھے۔ آپؐ، ان کے پورے کے پورے معاشرتی اور معاشی نظام کو بدلنا چاہتے تھے۔ قریش بہت بڑے تاجر تھے۔ اتنے بڑے کہ (قرآن کے الفاظ میں)

رِحْلَةَ الشِّتَاءِ وَالصَّيْفِ - (۱۰۶/۲)

ان کے کاروانِ تجارت، سردی، گرمی، سارا سال، رواں دواں رہتے تھے۔

ایک طرف تجارت، اور دوسری طرف کعبہ کی تولیت۔ اس سے ان کا پورا معاشی نظام، سرمایہ داری پر متفرع تھا۔ اور اس داعئ انقلابؐ کا پیغام، اس نظام کو ختم کرنے کا مدعی تھا۔ وہ اس کی اس طرح مخالفت نہ کرتے تو اور کیا کرتے؟ ان سرمایہ داروں کے سب سے بڑے نمائندہ، ابوجہل نے، جب غلافِ کعبہ کو تھام کر اس تحریکِ جدید کے خلاف اپنے معبودوں سے فریاد کی تھی تو اس میں اس نے کہا یہ تھا کہ یہ پیغام وہی ہے جو فارس میں ابھی ابھی مزدکؔ[1] لایا تھا۔ محمدؐ کو یہ سبق (معاذاللہ) سلمان فارسیؓ نے پڑھایا ہے ؎

ایں مساوات، ایں مواخات اعجمی است
خوب می دانم کہ سلمان مزدکی است

---

[1] ایران میں اشتراکیت کا داعی

انہوں نے حضورؐ سے مفاہمت کی صورت پیدا کرنے کے لئے اپنا جو نمائندہ بھیجا تھا ـــــ اس کی نمایاں خصوصیت یہ تھی کہ ـــــ وَجَعَلْتُ لَهٗ مَالًا مَّمْدُوْدًا (۷۴/۱۲)۔ اسے بڑی فراواں دولت حاصل تھی۔ ان مخالفین سے جب کہا گیا کہ یاد رکھو! اگر تم نے اپنی روش کو نہ چھوڑا تو تمہارا حشر بھی وہی ہوگا جو تم سے پہلے تمہارے جیسی قوموں کا ہوا تھا۔ وہ تم سے بھی زیادہ مال و دولت اور قوت و حشمت کی مالک تھیں ان کی بڑی بڑی بستیاں تھیں (۳۰/۹) جن کے اب صرف کھنڈرات باقی رہ گئے ہیں۔ (۲۷/۵۹) اس لئے تم جو اپنے مال و دولت پر اتراتے ہو، تو تمہارا انجام بھی انہی جیسا ہوگا۔ اس لئے کہ یہ خدا کا اٹل فیصلہ ہے کہ

جو شخص مال اور دولت جمع کرتا ہے اور پھر نتائج کے پھیر میں پھنس جاتا ہے۔ تو اس کا انجام تباہی ہوتا ہے۔ (۱۰۴/۱-۳)

تم "ربِ کعبہ" کی طرف نسبت رکھنے سے اس قدر مفاد حاصل کرتے ہو کہ نہ تمہیں رزق کی کمی کا اندیشہ ہوتا ہے نہ کسی قسم کا خوف و خطرِ لاحق۔ تو تمہیں چاہیئے کہ محکومیت بھی اسی رب کی اختیار کرو۔ (۱۰۶/۱-۴) لیکن انہوں نے ایک نہ سنی اور اپنی مخالفت میں تیز سے تیز ہوتے چلے گئے۔ چنانچہ جب ان کی ہلاکت پر ان کے انجام کی مہر تصدیق ثبت ہو گئی تو قرآنِ کریم نے ان کے نمائندہ (ابولہب) کا نام لے کر، ان کی تباہی کے سلسلے میں کہا کہ مَا اَغْنٰى عَنْهُ مَالُهٗ وَمَا كَسَبَ۔ (۱۱۱/۲) "اس کا اس قدر مال و دولت جو اس نے حاصل کر رکھا تھا، اس کے کسی کام نہ آیا"۔

"قرآن کا معاشی نظام" سردست میرا موضوع نہیں۔ میں اس عنوان پر بہت کچھ لکھ چکا ہوں ـــــ قرآنِ کریم کا مطالعہ اس نگاہ سے کیا جائے، تو یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ اسلام، نظامِ سرمایہ داری کے خلاف کھلا ہوا چیلنج ہے اور جو دین (نظامِ زندگی) وہ پیش کرتا ہے، اس کی مخالفت کے اقنومِ ثلاثہ (ملوکیت، مذہبی پیشوائیت اور سرمایہ داری) میں، سرمایہ داری کو برابر کی حیثیت حاصل ہے۔ چنانچہ اس نے واضح الفاظ میں کہہ دیا ہے کہ

(اس باب میں ایک اصولی حقیقت کو ہمیشہ سامنے رکھو۔ اور وہ یہ کہ) کوئی قوم اور بستی ایسی نہ تھی کہ اس میں ہم نے اپنے رسول کو بھیجا ہو جو انہیں ان کی غلط روشِ زندگی کے تباہ کن نتائج سے آگاہ کرتا تھا۔ اور وہاں کے آسودہ حال، دولت مند سرمایہ دار طبقہ (مترفین) نے اس کی مخالفت نہ کی ہو۔

وہ کہتے یہ تھے کہ ہمارے پاس مال و دولت کی فراوانی ہے اور ہمارا جتھہ بھی بہت بڑا ہے۔ اس لئے کس کی مجال ہے جو ہمارا بال بھی بیکا کر سکے۔ (۳۴/۳۴-۳۵)

یعنی اس وقت تک جو بات جزءً جزءً بیان ہو رہی تھی، قرآنِ کریم نے اسے ایک کلیہ کی حیثیت سے بیان کر کے دین اور نظامِ سرمایہ داری کے باہمدگر متضاد اور نقیض ہونے کی حتمی شہادت بہم پہنچا دی۔ یعنی خدا کی طرف سے جہاں اور جب بھی دین آیا، مترفین نے اس کی مخالفت کی۔ اس میں کوئی استثنےٰ نہیں۔ ہر جگہ اور ہر زمانے میں ایسا ہی ہوا۔ ان کے پاس ان کی اس مخالفت کی دلیل فقط یہ ہوتی تھی کہ نظامِ سرمایہ داری

ہمارے آباؤ اجداد سے متواتر چلا آ رہا ہے۔ ہم اس سے ہٹ نہیں سکتے۔

اور اسی طرح ہم نے کسی بستی میں اپنا رسول نہیں بھیجا کہ وہاں کے دولت مند طبقہ (مترفین) نے یہ نہ کہا ہو کہ ہم نے اپنے اسلاف کو جس راستے پہ چلتے دیکھا ہے' ہم اس راستے سے ایک قدم بھی ادھر اُدھر ہٹنے کے لئے تیار نہیں (۴۳/۲۳)

سورۂ "انبیاء" میں ان لوگوں کے انجام کو بڑے ڈرامائی انداز میں سامنے لایا گیا ہے' جہاں قرآن کی مخاطب قوم سے کہا گیا ہے کہ

اگر تم نے اپنی زندگی کا نقشہ قرآن کے مطابق مرتب کر لیا تو تمہیں عظمت اور بلندی حاصل ہو جائے گی۔ اگر اس کے خلاف چلے تو تم بھی اسی طرح تباہ ہو جاؤ گے جس طرح تم سے پہلے کتنی ایسی قومیں تباہ ہو گئیں جنہوں نے ظلم اور ناانصافی پہ کمر باندھ رکھی تھی۔ وہ تباہ ہو گئیں اور ان کی جگہ دوسری قوموں نے لے لی۔

ان کی غلط روش کے نتائج غیر محسوس طور پہ مرتب ہوتے چلے جا رہے تھے۔ انہیں ان کے انجام سے آگاہ کیا جا رہا تھا کہ وہ اس روش سے باز آ جائیں۔ لیکن وہ اس تنبیہہ پہ کان نہیں دھرتے تھے۔ چنانچہ وہ غیر محسوس نتائج آہستہ آہستہ آگے بڑھتے گئے۔ حتیٰ کہ جب وہ محسوس طور پہ سامنے آ گئے تو وہ اس تباہی سے بچنے کے لئے لگے بھاگنے۔

لیکن اس وقت بھاگنے کا کون سا موقعہ تھا۔ چنانچہ ہمارے قانونِ مکافات نے انہیں للکارا اور کہا کہ اب بھاگ کر کہاں جا سکتے ہو۔ مت بھاگو۔ اب اُلٹے پاؤں اپنی اپنی عیش سامانیوں کی طرف چلو (مَا اُتْرِفْتُمْ فِيهِ) جن کی سرشاریاں تمہیں اس قدر مدہوش کئے ہوئے تھیں۔ اور اپنے ان محلات کی طرف پلٹو جن کے اندر تم اپنے آپ کو اس قدر محفوظ تصور کیا کرتے تھے۔ وہاں چلو، تاکہ تم سے پوچھا جائے کہ یہ کچھ کس کی محنت سے بنا تھا اور تمہارا اس پہ کیا حق تھا؟ (۲۱/۱۱-۱۴)

قوموں کی تباہی کے سلسلہ میں قرآنِ کریم نے بتایا ہے کہ جب کسی قوم کی بربادی کے دن قریب آ جاتے ہیں۔ تو اس کا سرمایہ پرست طبقہ ہوسِ زر اندوزی میں حدود فراموش ہو جاتا ہے۔ سرمایہ دارانہ ذہنیت اس قوم پہ بُری طرح مسلط ہوتی ہے اور وہ صحیح روشِ زندگی کو چھوڑ کر غلط راہیں اختیار کر لیتی ہے۔ تو پھر وہ اس طرح ہلاک ہو جاتی ہے کہ اس کا نام و نشان تک باقی نہیں رہتا۔ (۱۷/۱۶)

سورۂ ھود میں ہے کہ تم اقوامِ گزشتہ کے احوال و کوائف پہ نگاہ ڈالو اور دیکھو کہ اس سے تم کس نتیجہ پہ پہنچتے ہو۔ کیا اس نتیجہ پہ نہیں کہ

جو لوگ تباہی سے بچ جاتے، ان میں سے بعد میں معدودے چند ایسے رہ جاتے جو اپنے مفاد کو قوانینِ خداوندی کے مطابق حاصل کرنے کی کوشش کرتے اور لوگوں کو ناہمواریاں پیدا کرنے سے روکتے۔ ورنہ باقیوں کا تو یہ حال ہو جاتا کہ وہ اپنی تن آسانی اور مفاد پرستی کے پیچھے لگے رہتے اور دوسروں کا سب کچھ لوٹ کھسوٹ کرتے جاتے، تاکہ ان کی عیش سامانیوں میں

فرق نہ آنے پائے۔ (خواہ باقی انسانوں پر کچھ ہی کیوں نہ گزرے) یہ تھے ان کے وہ جرائم جن کی بنا پر ان کی بربادی ہوتی۔ (۱۱/۱۱۶)

قوموں کی تباہی کے وقت سب سے زیادہ عذاب، اسی سرمایہ دار طبقہ پر وارد ہوتا ہے:۔

حَتّٰۤى اِذَاۤ اَخَذْنَا مُتْرَفِیْهِمْ بِالْعَذَابِ اِذَا هُمْ یَجْـَٔرُوْنَ۔

تاآنکہ اس قوم کا مرفہ الحال، سرمایہ دار طبقہ عذاب میں گرفتار ہو جاتا ہے، اور وہ کس بُری طرح سے چیختا چلاتا ہے۔ (۲۳/۶۴)

قرآنِ کریم کی تصریحات آپ کے سامنے آچکیں۔ ان سے آپ اندازہ لگا لیجئے کہ دینِ خداوندی کی رُو سے سرمایہ پرستی کی پوزیشن کیا ہے۔ لیکن اگر آپ کو اب بھی کسی قولِ فیصل کا انتظار ہے تو اُسے بھی سُن لیجئے۔ جہنم کے شعلے بھڑک رہے ہیں اور اس میں پڑے ہوئے لوگ چیخ چلا رہے ہیں۔ پوچھنے والا پوچھتا ہے کہ یہ کون لوگ ہیں اور انہوں نے کیا جرم کیا تھا جو یہ اس قدر شدید عذاب میں مبتلا ہیں؟

سوال آپ نے سُن لیا۔ اب جواب ملاحظہ فرمائیے۔ کہا کہ

اِنَّهُمْ كَانُوْا قَبْلَ ذٰلِكَ مُتْرَفِیْنَ۔ (۵۶/۴۵)

یہ سابقہ سرمایہ داروں کا طبقہ ہے۔

ہم سمجھتے ہیں کہ اس کے بعد، اس موضوع پر کچھ اور کہنے کی ضرورت نہیں۔

معراجِ انسانیت

سیرت صاحبِ قرآن (علیہ التحیۃ والسلام) خود قرآن کے آئینے میں مفکرِ قرآن کا بلند پایہ شاہکار، عقل و عشق، فکر و نظر، دل اور دماغ کا حسین امتزاج۔ اس سیرتِ طیبہ کے مطالعہ سے

مقامِ محمدی — اور — انقلابِ محمدی نکھر کر سامنے آجاتے ہیں

حسنِ معنوی کے ساتھ صوری پاکیزگی بھی دیدہ زیب، بڑی تقطیع، اعلیٰ درجہ کا سفید کاغذ۔ ضخامت پانصد صفحات۔ کتابت طباعت نورانی، جلد مضبوط اور دلکش — قیمت:-/۴۵ روپے (علاوہ محصول ڈاک)

ملنے کا پتہ

مکتبۂ دین و دانش چوک اُردو بازار لاہور ★ ادارہ طلوعِ اسلام ۲۵-بی گلبرگ ۲ لاہور